غبارِ خاطر کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

یکے از مطبوعات ساجد صدیقی بکسیلر اینڈ پبلشرز
۱۰۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

مصنف : ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
ناشر : ساجد صدیقی بکسیلر اینڈ پبلشرز، ۱۰۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
با اہتمام : ساجد صدیقی لکھنوی ★ ثروت لکھنوی
طابع : نامی پریس۔ لکھنؤ
پہلی اشاعت : اپریل ۱۹۷۱ء
سول ایجنٹ : شفاعت بکڈپو مولوی گنج لکھنؤ

قیمت

چار روپئے (علاوہ محصول ڈاک)

ساجد صدیقی بکسیلر اینڈ پبلشرز، ۱۰۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

انتساب

ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اُردو گورکھپور یونیورسٹی

کے نام

اقبالؔ کے اس شعر کے ساتھ

قبائے علم و ہنر لطف خاص ہے ورنہ
تری نگاہ میں تھی میری ناخوش اندامی

★

مصنّف ایک نظر میں

نام : ملک زادہ منظور احمد
تاریخ پیدائش : ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء ضلع فیض آباد۔
تعلیم : ایم، اے (انگریزی) ایم، اے (تاریخ) ایم، اے (اردو) پی۔ ایچ۔ ڈی۔
مشغلہ : لکچرر شعبۂ ادبیات اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی۔

مصنّف کی دوسری تصانیف

اُردو کا مسئلہ
کالج گرل
شہر سخن
مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن

فہرست

پیش لفظ

مولانا ابوالکلام آزاد کی عہد آفریں شخصیت جس میں بہت سے مسلمات کو رد کر کے خود اپنے لیے نئی شاہراہیں نکالیں گذشتہ نصف صدی کی سب سے بڑی اختلافی شخصیت رہی ہے لوگوں کا ایک طبقہ ان کے لئے جان کی بازی لگا سکتا تھا مگر دوسرا ان کے خون کا پیاسا بھی رہا ہے افراط و تفریط کے اس سیاسی سیلاب میں ابوالکلام اپنے عقیدے کی مضبوط چٹان پر زندگی بھر استقامت کے ساتھ کھڑے رہے اور ان کا قلم سیاسی اور غیر سیاسی موضوعات پر گل افشانی کرتا رہا۔

زیر نظر کتاب میں مولانا کی شہرۂ آفاق تصنیف "غبار خاطر" کا ادبی نقطہ نگاہ سے تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس عام نظریہ سے انحراف کرتے ہوئے کہ "غبار خاطر" میں شامل مضامین "نج کے خطوط" ہیں ان کو انشائیہ نگاری کی بہترین مثال قرار دیا گیا ہے اور ان کے معائب اور محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ مقالہ بنیادی طور پر مصنف کی ضخیم کتاب "ابوالکلام آزاد فکر و فن" کا ایک حصہ ہے جو شایع ہو چکی ہے مگر قیمت زیادہ ہونے کے باعث وہ ان طلبار اور طالبات کی دسترس سے باہر ہے جن کے نصاب میں "غبار خاطر" کا تفصیلی مطالعہ شامل ہے۔

میں "ساجد صدیقی بکسیلر اینڈ پبلشرز، ۱۰۔ لاٹوش روڈ، لکھنؤ" کا شکور ہوں کہ انھوں نے میری توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی اور "غبار خاطر" سے متعلق حصہ کو الگ سے کتابی صورت میں شایع کرنے پر آمادگی ظاہر کی تاکہ یونیورسٹیوں میں اردو پڑھنے والے طلبار کو کم قیمت پر کتاب سے متعلق سارا مواد ایک ہی جگہ پر دستیاب ہو جائے۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے کچھ ترمیم و تنسیخ کر کے یہ کتاب شایع کی جا رہی ہے۔

کتاب کے ابتدائی حصہ میں "ابوالکلام" کے ذہنی پس منظر کو سمجھنے کے لئے ان عناصر کا بھی تجزیہ کیا گیا جو ان کی تشکیل فکر میں ممد و معاون ثابت ہوئے اور "غبار خاطر" سے قبل ان کی ادبی تصانیف کا بھی سرسری جائزہ لیا گیا ہے تاکہ قارئین مجموعی طور پر ان کے اکتسابات کا صحیح اندازہ لگا لیں اور پھر "غبار خاطر" کے ساتھ ساتھ "کاروانِ خیال" پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے جو ان کے انشائیوں میں پائی جاتی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جس مقصد کے پیش نظر یہ مقالہ الگ سے شایع کیا جا رہا ہے اس سے یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبار اور طالبات فائدہ اٹھا سکیں گے۔

(ڈاکٹر) ملک زادہ منظور احمد

شعبۂ اردو
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

۲۰ مارچ ۱۹۷۱ء

★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا آزاد کی تشکیل فکر اور ابتدائی تصانیف کا جائزہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ ذکر و فکرِ خانقاہی کا ماحول تھا، ان کی تربیت اس گھر میں ہوئی تھی جس کی چہار دیواری کے اندر روایات سے انحراف کفر و زندقہ کے مترادف سمجھا جاتا تھا، ان کی تعلیم ان اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی تھی جو ان کے والد کے معیار عقاید پر پورے اتر چکے تھے، اور ان کے والد کا وہ معیار جس پر عقاید کو جانچا جاتا تھا اتنا سخت اور بے لچک تھا کہ اس پر خود احمد رضا خاں بریلوی پورے نہ اترتے تھے، یہ ہاتھ باندھے ہوئے مؤدب مریدوں کی دنیا تھی جس میں مولانا خیرالدین اور ان کے صاحبزادگان کی عقیدت اور محبت فلاح دارین کا وسیلہ سمجھی جاتی تھی۔ ارادت مند کیچڑ بھری ہوئی زمین پر زانو رکھ کر گر جاتے اور جوتوں کو چومتے، خاک ان کے چہروں پر لگ جاتی، کیچڑ کے دھبوں سے کپڑے داغ دار ہو جاتے، مگر جوشِ عقیدت میں انھیں ان باتوں کی کچھ پرواہ نہ ہوتی، وہ پاؤں کے تلوے چاٹنے لگتے۔ عقیدت و ارادت کی اس

فضا نے کچھ دنوں کے بعد خود بخود ایک مبہم اور مجرد اشکراہ کی صورت اختیار کر لی، اور مولانا کا ذہن طلب و جستجو اور آزادی فکر و رائے کی راہوں پر آگے بڑھنے لگا، ایک ایسے ماحول میں جس میں بیرونی ہواؤں کا قطعی گذر نہ تھا، اس انقلاب فکر کے اسباب و علل کی سراغ رسانی مولانا کے مزاج کی شعریت اور اس ذہن عربی سے ہوتی ہے جو ان کو اپنی والدہ کی طرف سے ملا تھا، عربی ذہن انتہائی تخیلی اور رومانی ہوتا ہے، اور شاعرانہ افتادِ طبع تقلیدِ روایات کے حصار سے ہمیشہ باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے۔ تخیلیت اور رومانیت کے یہی عناصر خاندانی اوضاع و اطوار پر ایک طرح کی بے اطمینانی کے خالق بنے، چند دنوں کے بعد خیالات نے زیادہ وسعت اختیار کی، غور و فکر سے مزید روشنی ملی صدہا سوالات سامنے آئے۔ فرق اور رسوم کی طرف سے مولانا کے دل میں بے اطمینانی پیدا ہونے لگی، جو بعد میں چل کر ایک طرح کی نفرت میں تبدیل ہو گئی۔

اسی زمانے میں اردو نثر و نظم کے مطالعے اور شاعری کے جنون نے آزاد زندگی کی تڑپ میں اور بھی زیادہ اضافہ کر دیا، یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید کا طلسم ان کی پوری ہستی پر محیط ہو گیا، اور مولانا ایک معمول کی طرح ان کے افکار و خیالات پر گامزن ہو گئے، صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ سرسید نے ان کے خاندانی اور موروثی عقاید پر ضرب لگائی، اور تقلید کی چادر چہار دیواری سے باہر لا کر انھیں وسیع فضاؤں میں کھڑا کر دیا۔ بلکہ تعقل و تفکر، تحقیق و جستجو کی اتنی منور شمعیں روشن کر دیں کہ مولانا کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور مذہبی افکار و اعمال کا جو تسمہ برائے نام لگا رہ

گیا تھا وہ بھی کٹ کر الگ گر پڑا، اور نوبت یہاں تک پہونچی کے عقاید کے جتنے حصے سرسید منوانا چاہتے تھے وہ مولانا کی نگاہ میں وہم و خیال ہو گئے، وجود باری، ذات و صفات، بقائے روح، وحی و الہام، نبوت شرایع و ادیان، یہ سب کے سب جہل و اوہام کی اختراع معلوم ہونے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی اعمال و ظائف جو زندگی کے امور عادیہ میں داخل ہو گئے تھے، رفتہ رفتہ ترک ہو گئے،" اعتزال قدیم و جدید کے ذوق نے طبیعت میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ مذہبی عقاید کا صحیح مقام تطبیق عقل و نقل کے ساتھ ہے، اور یہ خیال بطور اصل اصول کے ذہن نشین ہو گیا تھا کہ وہی مذہبی اعتقاد صحیح ہے، جو عقل اور معلومات مادیہ کے مطابق ہو علم و حقائق، قوانین قدرت، سنن فطریہ، یہ تمام الفاظ نوک زبان تھے اور ابن رشد اور سرسید کی طرح (مولانا) کو پورا اعتقاد تھا کہ قرآن بھی اسی کا داعی ہے، اور فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا اور سنۃ اللہ سے مقصود یہی لاز آف نیچر اور قوانین مادیہ ہیں، لیکن اس ضمن میں طلب و جستجو جب زیادہ بڑھی تو معاً دوسری منزل سامنے آگئی، دماغ جو اس معیار اعتقاد کا خوگر ہو چکا تھا، اسی حد پر قانع نہیں رہ سکتا تھا جو اس مسلک کے زعیم خواہ مخواہ بلا کسی دلیل کے قرار دیتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ اساسات ادیان و شرایع اسی محک کے سامنے خود بخود آگئے اور کسے گئے تو دماغ نے محسوس کیا کہ ٹھیک نہیں اترتے، اس طرف تو ذہن نہیں گیا کہ یہ کسوٹی ہی سرے سے غلط ہے، لیکن عقاید کے اذعان و یقین کا خاتمہ ہو گیا[1]" ذہنی کرب اور زندگی کے تاریک دور میں جب کفر و الحاد

---

[1] آزاد کی کہانی، صفحہ ۳۱۸

کی وادیاں طے کر رہے تھے، مولانا نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری اور
ان متفرق مضامین سے کیا جو مختلف رسائل میں شایع ہوئے،

مولانا کی ادبی زندگی کا یہ ابتدائی
دور ایک تجرباتی دور تھا اور چوں کہ خود ان کی شخصیت نے اپنے
خدوخال متعین نہیں کئے تھے اور آئے دن ان کے ذوق و افکار میں
نمایاں تبدیلیاں ہو رہی تھیں، اسی لئے نومشقی کی خامیوں کے ساتھ ساتھ
ان کی طرز تحریر اور انداز فکر میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، الہلال کے اجرا کے پہلے
انھوں نے جو کچھ بھی لکھا، اس کے اندر خصوصیت کے ساتھ دو نمایاں
عناصر کوئی شخص محسوس کر سکتا ہے، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے موضوعات
پر سرسید کے زیر اثر تطبیق عقل و نقل کا جذبہ بڑے ہی جوش و خروش کے
ساتھ حاوی ہے، اور اسلوب نگارش پر محمد حسین آزاد کی پرچھائیاں پڑتی ہیں
"فقہا کی تقسیم کے مطابق اگر سرسید مجتہد مطلق تھے تو (مولانا) گویا مجتہد
فی المذہب کا درجہ حاصل کرنا چاہتے تھے"۔[1]

اس دور کی بیشتر تصنیفات جن کا تذکرہ ملیح آبادی نے کیا ہے آج کالعدم
ہو چکی ہیں، اور ان کا کوئی پتہ بڑے کتب خانوں میں نہیں چلتا، مگر ملیح آبادی
کی زبانی یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ بہت سے مسائل جن پر سرسید نے تصریح
کے ساتھ کچھ نہیں لکھا تھا، لیکن ان کے اصول و مقدمات سے ان کا استنباط
ہو سکتا تھا، ان پر مولانا نے کافی خامہ فرسائی کی تھی، ان کا ارادہ
تھا کہ مسلک سرسید کو عقائد کی ترتیب کے اعتبار سے مدون کیا جائے، اور
سرسید کے علم کلام کا ایک تفصیلی جائزہ لیا جائے، "العلوم الجدیدۃ والاسلام"

---

[1] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۳۹۸۔

کے نام سے مولانا کی جس کتاب کا ذکر ملتا ہے، اس کے ایک حصّہ میں انقلاب علوم اور اس کے لئے نئے علم کلام کی ضرورت پر بحث کی گئی تھی، اور دوسرا حصّہ گویا سرسید کے علم کلام کا پورا متن تھا، اس دور میں مولانا کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر جدید علم کلام میں کوئی علم کلام دفاع مذہب میں کام آسکتا ہے تو وہ سرسید کا علم کلام ہے، دوسری خاص بات جو اس زمانے کی تحریروں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا کا وہ اسلوب بیان جس کی شہرت الہلال کے مضامین اور تذکرہ سے ہوئی، وہ ابھی پیدا نہ ہو سکا تھا، خطابت اور طنز کے جراثیم ضرور کہیں کہیں پر اس دور میں مل جاتے ہیں، مگر زیادی طور پر سرسید اور محمد حسین آزاد کے اسلوب نگارش کا غلبہ ان کی تحریروں میں ملتا ہے اور اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ عربی و فارسی تراکیب مقابلۃً کم تھیں، اور زبان سادگی کی طرف مائل تھی، بات کو پھیلا کر کہنے کا انداز اور خیالات کی تکرار کی طرف ان کا رجحان پیدا ہو چلا تھا، انانیت کی دبی دبی لہریں انکسار کے پردوں میں رہ رہ کر نمایاں ہو جاتی تھیں، اور تعقّل و تفکر کی باتیں کرتے وقت بھی جذبات کا رومانی وفور طریق استدلال اور تصریح مباحث پر غالب ہو جاتا تھا، فنِ اخبار نویسی اور خاقانی شیروانی پر ان کے جو مضامین بالترتیب مئی ۱۹۰۲ء اور اگست ۱۹۰۲ء کے "مخزن" لاہور میں شایع ہوئے، ان پر سرسید اور محمد حسین آزاد کے فکر و فن کا غلبہ نظر آتا ہے "فن اخبار نویسی" پر ان کا مضمون اسلوب اور فکر دونوں کے اعتبار سے سرسید کی یاد دلاتا ہے، اخبار کا موجد کون تھا، انگلستان فرانس، روس، امریکہ میں پہلا اخبار کب کب شایع ہوا، اخبار کی کون کون سی قسمیں ہیں، اس کی تعریف کیا ہے، اور پھر اخبار کے فوائد، اس کی خاص

صفتیں کیا ہیں، اور اخبار کے متعلق نامور لوگوں نے کیا کیا رائیں دی
ہیں، ان تمام مباحث اور مسائل پر انھوں نے اسی انداز میں خامہ فرسا
کی ہے جو سرسید کا طرۂ امتیاز رہی ہیں، جملوں کی ساخت، الفا
کا انتخاب، مغربی اقوام کی ترقی پر تحسین آمیز نگاہ ڈالنا، جگہ جگہ انگری
الفاظ کا استعمال سب سرسید کا چربہ معلوم ہوتا ہے، اس مضمون کی ابتدا
چند سطریں ملاحظہ ہوں:

"یورپ اور امریکہ نے جو آج کل حیرت انگیز ترقی کی ہے اور
علوم و فنون، تہذیب و شائستگی میں جو ان کا آج طوطی بول
رہا ہے، ان میں منجملہ اور اسباب ترقی کے ایک بڑا سبب
اخبار دیکھنا ہے، جسے اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اور بچے سے
لے کر بوڑھے تک روزانہ ہر ایک دیکھا کرتا ہے، اور علمی و
عملی فیوض حاصل کرتا رہتا ہے۔"

اسی طرح حکیم خاقانی شیروانی پر ان کا مضمون محمد حسین آزاد کی "آب حی
سے متاثر ہو کر لکھا گیا، اور مولانا کے نوٹ کے ساتھ اگست ۱۹۰۲ء
مخزن میں شائع ہوا، مولانا کے نوٹ سے پتہ چلتا ہے کہ شعرائے پار
کے جتنے بھی تذکرے فارسی میں لکھے گئے کسی پر بھی جامعیت کا اطل
نہیں ہوتا، آزاد بلگرامی کے "خزانۂ عامرہ" اور علامہ ہدا
کا تذکرہ "مجمع الفصحا" بھی ناقص رہے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:

"یہ تو حال فارسی تذکروں کا ہے، اردو کے معلّیٰ تو اپنے شاعروں
کے تذکروں سے محروم تھی، یہ تو پروفیسر محمد حسین آزاد کی حمایت
ہے کہ انھوں نے آب حیات لکھ کر کلنک کا ٹیکہ مٹایا، ہم نے

حال دیکھ کر ایک تذکرۃ الشعراء کی بنیاد ڈالی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جامعیت کا لطف پیدا کیا جائے ساتھ ہی پرانے طرز کو ترک کر کے سوانح عمری کے طور پر حالات لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور مختلف مقامات سے تذکرے جمع کر کے پہلی جلد تالیف کی گئی ہے جس میں سے نمونہ کے طور پر حکیم افضل الدین خاقانی کی لائف ناظرین مخزن کی دلچسپی کے لئے پیش کی جاتی ہے[1]۔"

مولانا کا یہ تذکرہ آبحیات کی طرزِ تحریر کی بھونڈی نقالی معلوم ہوتا ہے تشابیہ و استعارات کی زور پر عبارت کو رنگین بنانے کی کوشش شروع سے آخر تک کی گئی ہے، ایک اقتباس دیکھئے:

"پانچویں صدی کے اوائل میں یہ صبح صادق کا چمکتا ہوا تارا عالم اجسام کے آسمان پر نمودار ہوا اور اہلِ عجم کے لئے نیر اعظم ہو کر چمکا جس کی روشنی نے نہ صرف مشرق ہی کو روشن کیا بلکہ اپنی تیز شعاعوں سے اہلِ مغرب کی بھی آنکھیں روشن کر دیں ہمارے نامور ہیرو کے والد کا پیشہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے غالباً نجاری تھا، کیا عجب ہے کہ آبا و اجداد کا بھی پیشہ ہو مگر اس بارے میں تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں[2]۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت مولانا ایک تجرباتی دور سے گزر رہے تھے اور ان کا طرزِ تحریر ہر لحظہ بدلتا رہتا تھا، ابھی اس میں انفرادیت کے تیور پیدا نہ ہوئے تھے۔

---

[1] مخزن جلد ۳ نمبر ۲، اگست سنہ ۱۹۰۲ء [2] مخزن جلد ۳ نمبر ۲، اگست سنہ ۱۹۰۲ء

سرسید کے علوم و معارف نے جو نشہ مولانا کے دماغ پر طاری کر دیا تھا اس
کو محسن الملک کی تحریریں بھی ختم نہ کر سکیں، جن پر سرسید کا بے باکانہ اجتہاد
شاق گذرا تھا، وہ ایک حد تک بین بین راہ پسند کرتے تھے، اصول تفسیر
کے متعلق جب ان کے مکاتیب شایع ہوئے اور انھوں نے یہ ثابت
کرنے کی کوشش کی کہ سرسید کے جو نئے خیالات سمجھے جاتے ہیں وہ اصولاً نئے
نہیں ہیں، بلکہ پچھلے مسلمانوں کے بھی ایسے خیالات رہے ہیں تو مولانا کے
ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید لوگوں کو وحشت سرسید کے اختراع اور جدت
خیال سے ہوتی ہے، کیوں نہ ان کے خیالات کو پہلے کے لوگوں میں تلاش کیا
جائے، چنانچہ اسی سلسلہ میں خیال ہوا کہ "اس رنگ کی سب سے بڑی
جماعت معتزلہ کی ہے، فی الحقیقت ان کا ظہور اور ان کے خیالات کا نشو و نما ٹھیک
انھیں ظروف و احوال میں ہوا جو اس وقت سرسید اور ان کے رفقاء کو پیش
آئے ہیں، اِس وقت یورپ کے نئے تمدن اور علوم سے مقابلہ ہے اُس وقت
قدیم علوم سے تھا، فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان صاحبِ حکومت و تمدن تھے
اس لئے اجتماعی دفاع اس قدر منفعل نہ تھا، جس قدر موجودہ عہد تنزل
میں ہے، اور اس لئے معتزلہ قدیم میں جتنی اسلامی فعالیت نظر آتی ہے، اس
سے معتزلۂ جدید خالی ہیں[1]"، اس انتقال ذہنی نے مولانا کے مطالعہ میں
مزید وسعت پیدا کی، خصوصیت کے ساتھ سید شریف مرتضی کی "کتاب الامالی"
ابوبکر یحییٰ کی کتاب "الملل والنحل"، مقریزی کی "تاریخ مصر"، "تفسیر کبیر"
امام ابن حزم کی "المفصل"، "شہرستانی"، "شہرزوری"، تاریخ الحکماء
قفطی وغیرہ انھوں نے خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھیں، اور ان کا ارادہ

---

[1] آزاد کی کہانی - صفحہ ۱۰۱ -

ہوا کہ ایک کتاب معتزلہ کے حالات میں لکھی جائے، مولانا شبلی سے بھی انھوں نے اسکے مواد و ماخذ کے بارے میں دریافت کیا تھا، " لیکن انھوں نے مایوس کن جواب دیا "[1] چنانچہ سرسید کا نشہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا، اور علم و آگہی کے جو چراغ انھوں نے روشن کئے تھے، اس کی تجلّی میں ان کا دامن مولانا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، عقاید و کلام کے انہماک اور اختلافات و مشارب کے مطالعہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ مولانا کی طبیعت میں از سر ایک اضطراب پیدا ہو گیا اور جو درمیانی سکون سرسید کی تقلید میں ملا تھا وہ ختم ہو گیا، کاوش و جستجو، غور و تفکر، مطالعہ و نظر، شکوک کے خالق بنے، " اور یہ بات سب سے بڑی آفت ہو گئی تھی کہ جس قدر بھی آگے بڑھتے تھے تاریکی بڑھتی جاتی تھی اور روشنی ناپید تھی، اسی زمانے میں مولانا نے ادیان مشہورہ کی طرح اسلامی مذاہب کا بھی بقدر امکان مطالعہ کرنا چاہا، لیکن اب مطالعہ و نظر ہی اس زہر کی تیزی بڑھا رہا تھا، جس کا جام (ان کے) ہاتھ میں تھا "[2] وجود باری، بقائے روح اور معاملات معاد کا یقین کیونکر حاصل ہو، ان کا اعتراف ماورائے احساس کیوں کیا جائے، دین و شریعت میں اختلاف و تعدّد کیوں ہے، متخالف دعووں کی موجودگی میں مذہب کی اصلیت اور صداقت کو کیونکر تلاش کیا جائے، خود زندگی کیا ہے؟ کیونکر وہ یقین حاصل کیا جائے جو زندگی اور زندگی کے مقاصد کو اسی طرح واضح کر دے جس طرح تمام محسوسات واضح ہیں۔ اسی طرح کے صدہا سوالات اور سیکڑوں گرہیں، مولانا کے ذہن میں پیدا ہو چکی تھیں، خاندانی روایت اور روشن خیالی کے اس تصادم میں ایک

---

[1] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۳۰۴ [2] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۱۹۱۔

بے بس اور مایوس شکست مولانا کے حصہ میں آئی، انھوں نے اس مہلک انکار سے بچنے کے لئے سیکڑوں موجودہ لائل اختراع کئے، صدہا دلیلیں پوری طاقت سے مقابلہ میں صف آرا کر دیں، مگر مقاومت اتنی قوی تھی کہ اس کی فتح تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔

ذہنی کشمکش کے اس اضطرابی دور میں شبلی کی تصنیفات اور ان کی صحبت نے مولانا کو یقیناً سکون بخشا ہوگا، اور اس شگاف کو پُر کیا ہوگا جو سرسید کی تحریک نے مولانا کے ذہن میں ڈال دئے تھے، زندگی کے برحق ہونے کا یقین، عمل اور ترقی کی اہمیت، انسان اور اجتماع کا تمدنی اور معاشی رابطہ، عقل و دانش کی برتری، مادیات کی اہمیت اور اسی طرح کے دیگر مباحث جن کے گرد سرسید کا پیدا کردہ ادب حکم کر رہا تھا اس میں انسان کا جذباتی نفس گم ہوگیا تھا اور اس کی دھڑکنیں بہت دھیمی پڑ گئی تھیں، اس تحریک نے بقول ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ "جو ذہن نیا بنائے ان کی بڑی کمزوری زندگی کی مادی اقدار سے ہمہ گیر عقیدت اور روحانی اقدار کے متعلق تشکیک تھی، نفس انسانی کے جذباتی عوامل سے بے خبری اور تسلسل حیات کے سلسلۂ عمل میں ماضی کے مؤثرات سے غفلت اور اس قسم کی دوسری کمزوریوں نے اس تحریک کی نافعیت کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔"[۱]

شبلی نے سرسید کی اس نری عقلیت کے خلاف جس نے ایک طرف وجدان اور جذبے کو نظر انداز کر دیا تھا اور دوسری طرف بعض متوسط درجے کے مادی اقدار سے مصالحت کر لی تھی، آواز بلند کی، یہ آواز

---

[۱] مباحث۔ مجلس ترقی ادب لاہور، صفحہ ۲۸، طبع اول۔ فروری ۱۹۶۵ء۔

جو مادی قدروں کی منکر نہ تھی، مگر مادیات کی تسخیر برتر انسانی تہذیب کے مقصد سے کرنا چاہتی تھی، مولانا کے مزاج کے عین مطابق تھی، چنانچہ ان کے اندر مولانا کو وہ عناصر مل گئے جن کے لئے ان کی روح بے چین اور مضطرب تھی، شاندار ماضی کی مثال پر مستقبل کا تصور، اس کی تعمیر کے لئے جد وجہد، عملی سرگرمی، آزادی و حق گوئی، خودداری، خود شناسی، بے خوفی، بے باکی، قربانی کے سارے نقوش شوخ رنگوں میں ظاہر ہونے لگے، اور انھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مفاہمت اور مصالحت کے ان تمام رجحانات کو بھی مٹا ڈالا، جن میں سرسید کی عقلیت کے زیر اثر شبلی بڑی حد تک جکڑے ہوئے تھے، چنانچہ ۱۹۱۰ء کے وسط میں جب انھوں نے سرمد شہید پر اپنا مضمون لکھا تو ذہنی ارتباط اور ......

...... جذباتی ہم آہنگی کی بنا پر سرمد کے جذب و جنوں کی داستان اس والہانہ ربودگی اور جذباتی وفور کے ساتھ بیان کی کہ عالمگیر کے مناقب و فضائل بھی اس کے آگے ماند پڑ گئے۔ مولانا کا یہ مضمون ان کی ابتدائی ادبی زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کے اندر ان کے فکر و فن کی وہ تمام کرنیں نظر آتی ہیں جنھوں نے آگے چل کر مولانا کے دیگر اکتسابات میں اور بھی زیادہ تابناکی حاصل کی، خصوصیت کے ساتھ تذکرہ ترجمان اور غبار خاطر میں جا بجا ان کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں، مولانا کی تحقیقی بصیرت، ان کی وسیع المشربی، علماء سو سے ان کی نفرت، عشق مقاصد میں زندگی کے شدائد سے استلذاذ حاصل کرنا، اور جابران وقت کی تعزیرات کی پرواہ کئے بغیر دار و رسن کے مراحل کو آسان بنا لینا اور وہ تمام دیگر رجحانات جو مولانا کی زندگی اور ادب میں پائے جاتے ہیں ان

سب کا مختصر اور اجمالی خاکہ اس مضمون میں آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے
فقہائے اسلام کے مقابلہ میں، سرمد اور عالمگیر کے مقابلہ میں دارا شکوہ
سے ان کی ہمدردی اور صرف یہی نہیں بلکہ اسلام کی اس پوری تاریخ پر
کڑی تنقید میں جس میں دار الافتاء کے قلم اور سپہ سالار کی تلوار دونوں
نے یکساں طور پر صوفیاء، ارباب باطن اور نکتہ بیں علمائے شریعت کے
خون بہائے ہیں، یہ ساری کی ساری علامتیں اس بدلے ہوئے رجحان
کی نشان دہی کرتی ہیں، جس میں مذہبی دیوانگی کے مقابلے میں حقیقی
مذہبی جذبہ کی قدر پر زور دیا جاتا ہے، اور جس تک پہونچنے کے لئے
عقل کے ساتھ ساتھ پر خلوص جذبات اور وجدان کی ہدایت بھی ضروری
ہوتی ہے، جذباتی طور پر سرمد کے ساتھ ہونے کے باوجود مضمون کے آخر
میں عالمگیر کے بارے میں یہ کہتے ہوئے کوئی رائے نہ دینا کہ تاریخ
قیاس و ظنون اور شخصی آرا کے مجموعہ کا نام ہے، آج چند میلوں کے
فاصلہ پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق البیان
نہیں ہوتے، کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی اور
عالمگیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا[1]، اس بات کو
ظاہر کرتا ہے کہ اجتماعی مفادات کے پیش نظر معاملات میں اعتدال
توازن اور میانہ روی کی روایت کی طرف مولانا کا جو غالب رجحان تھا اس
کی داغ بیل بھی ان کے ابتدائی دور ہی میں پڑ چکی تھی اور حقیقت
تو یہ ہے کہ مولانا کے ادبی اور ذہنی اکتسابات میں جو تعدد و تنوع تھا
ان سب کا ایک حسین گلدستہ اس مضمون کی شکل میں ہمارے سامنے

---

[1] حیات سرمد۔ صفحہ ۲۶۔

آیا تھا، اور اگر امتیازانہ رنگ و نکہت کا سوال اُٹھا کر اس کا تجزیہ کیا جائے تو وہ تمام عناصر اس میں الگ کئے جا سکتے ہیں جن کی تفصیل ان کے بعد کے اکتسابات میں ہم کو ملتی ہے، ان کے تمام پسندیدہ کردار چاہے وہ سرمد ہوں یا فاطمہ بنت عبداللہ، نیازی ہوں یا علائی، سب کے سب اپنی لگن میں مست، عواقب و نتائج سے بے نیاز، آفات ارضی و سماوی کی پرواہ کئے بغیر، زندگی کے مراحل کو موت کی سرحدوں تک رقصاں و غزلخواں طے کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

ابوالکلام نے خود اپنی زندگی میں کانٹوں کے فرش کو اپنے عقیدے کی پختگی اور تخیل کی مدد سے شبستانِ راحت بنا لیا تھا، اور ان کو فطری طور پر ہر اس کردار سے ہمدردی تھی جس میں خود ان کی اپنی شخصیت کا جلوہ نظر آتا تھا، سرمد مولانا کے الفاظ میں اس منارۂ عشق پر تھا جہاں کعبہ و کلیسا بالمقابل نظر آتے ہیں، اور جہاں کفر و ایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں، مولانا خود زندگی بھر دار و رسن کا کھیل کھیلتے رہے اور انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا جو نقشہ مرتب کیا تھا اور جو مقصد اپنے سامنے رکھا تھا، اس میں بے تعصبی اور رواداری کی روایت بنیادی اہمیت رکھتی تھی، وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے پہلی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دی، اور برطانوی طاقت کے استحصال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک متحدہ نصب العین کی ضرورت کا احساس دلایا، "حیات سرمد" راقم الحروف کے نزدیک مولانا کی ابتدائی زندگی کے اختتام کا اعلان ہے، یہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کی ادبی اور صحافتی زندگی کا وہ دور جو گلدستوں سے شروع ہو کر "وکیل" امرتسر کی ادارت

تک پھیلا ہوا ہے، اب اس کی خاطر خواہ تشکیل ہو چکی تھی اور مولانا نے لوح
و قلم پر اتنا قابو پا لیا تھا کہ وہ ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال بھی
کریں اور صاحب طرز ادیب بھی کہلائیں۔

الہلال والبلاغ

الہلال کا اجرا اُردو صحافت اور اُردو ادب
دونوں کے لئے ایک چونکا دینے والا واقعہ
تھا، اردو خواں پبلک نے ایسا فعال جریدہ ابھی تک نہ دیکھا تھا،
اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں ہی میں آندھی اور طوفان بن کر لوگوں کے
دل و دماغ پر چھا گیا، اس کے پیچھے مولانا کی گزشتہ صحافتی زندگی کے
تجربات کے علاوہ ان کا تبحر علمی اور اسی کے ساتھ ساتھ روح عصر کی باگ
پکڑ کر متعینہ منزل کی طرف اس کا رُخ پھیر دینے کا عزم بھی کام کر رہا تھا
ان کو اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے خود اپنا ذاتی اخبار نکالنے
احساس تو وکیل امرتسر کی ادارت ہی کے دوران میں ہو گیا تھا، اور
اس چیز کا احساس کہ "اخبار دراصل ایک زندہ ہادی ہے جو ہر قسم کی
باتوں میں ہدایت کرتا ہے، بری باتوں سے تنفر دلاتا ہے اور عمدہ باتوں
کی طرف مائل کرتا ہے" ۱۹۰۲ء کے قبل ہی ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں
مصر اور ترکی کے سفر نے ان کو عرب اور ترکی کی قوم پرور انقلابی تحریکوں
کے مطالعہ کا موقع دیا اور ان تحریکات کو آگے بڑھانے میں اخبارات
نے کیا رول ادا کیا تھا اس سے بھی وہ خاطر خواہ واقف ہو چکے
تھے، اس اخبار کے ذریعہ مولانا ابوالکلام آزاد نے نہ صرف مذہبی

۵؎ مخزن جلد ۳ نمبر ۱ مئی سنہ ۱۹۰۲ء - فن اخبار نویسی۔

میں وقت کے اہم سیاسی مسائل کا احساس اور عمل کا ذوق بیدار کیا بلکہ اُسی کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں مذہب کی عزّت اور محبت پیدا کردی، میرے کہنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ مذہبی طبقہ میں سیاسی مسائل کا احساس اور عمل کا ذوق پہلے سے موجود نہیں تھا بلکہ اس کا ماحصل صرف یہ ہے کہ علمائے حق کی وہ تحریک جو شاہ ولی اللہ سے شروع ہوئی تھی اور جس میں مذہبی فکر و عمل میں سلف کی تقلید کے ساتھ ساتھ ہر دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا، اور جس نے سید احمد بریلوی کے ہاتھوں میں سیاسی تحریک کا رنگ اختیار کیا تھا اور جس میں حاجی امداد اللہ، مولانا قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی نے مذہبی قوم پروری کا رنگ بھرا تھا اور جس کا رخ مولانا محمود الحسن نے سیکولر قوم پروری کی طرف موڑا تھا اس تحریک میں نیا رنگ و آہنگ مولانا نے الہلال کے ذریعہ پیدا کیا، انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کے اندر حقیقی مذہبی روح کو اُبھارا، بلکہ مذہبی اور معاشرتی زندگی کی از سرِ نو تنظیم پر بھی زور دیا، اور انھیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اکثریت کا خوف دل سے نکال کر کانگریس کی قومی تحریک میں شریک ہوں، اور اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر "حکومت خود اختیاری" کے لئے جد وجہد کریں، انھوں نے دین اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہ کیا بلکہ آزادیِ وطن کے لئے جد وجہد کو مذہبی فریضہ کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ اور پہاڑوں پر رعشہ سیماب طاری کردینے والا لب و لہجہ اختیار کرکے ان کے خوابیدہ ذہنوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا، انھوں نے یہ سبق ممکن ہے جمال الدین افغانی اور عبدہٗ سے سیکھا ہو، مگر اس میں ذرا

بھی شک نہیں کہ جن لوگوں کے اندر وہ اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کر رہے تھے، ان کے سامنے اردو زبان میں اس طرح کا کوئی نمونہ پہلے سے موجود نہیں تھا، اور وہ اس رعب دار لب و لہجہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ سب اس دور میں ہوا جب ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گذر رہا تھا، اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے سخت انتشار برپا تھا، ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی، جمہوریت کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے اور دنیا نہ فتحپوری کے الفاظ میں "قومی آزادی و خودداری کا احساس آزمائشی دور سے گذر رہا تھا، برطانوی مستعمرات کا طنطنہ ختم تو نہ ہوا تھا اس کے سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہر انسانیت شکن اقدام پر آمادہ تھا۔"[1]

کانگریس نے ہندوستان کی آزادی کا جو بیج بویا تھا، اس کو جماعت پیدا کر کے انگریز بار آور ہونے سے روکنے کے لئے جد و جہد کر رہا تھا کی تعلیمات اور علی گڈھ کی تحریک کی بنا پر مسلمانوں کے نگاہ ہو انگریزوں کا جو احترام پیدا ہو چکا تھا اس کے اثرات فضا میں ہنو تھے، اور ان کی اکثریت ملکی مسائل کو چھوڑ کر پان اسلام ازم کی میں الجھی ہوئی تھی، ترکی، بلقان اور طرابلس کے ساتھ ساتھ مذہبی کا احساس انھیں اپنی جانب متوجہ کئے ہوئے تھا اور مسلمانوں قابل ذکر اخبارات شہدائے بلقان کا ماتم کر رہے تھے، زمیندار کی توجہ ترکی پر مرکوز تھی، مسلم گزٹ انگریزوں سے ناخوش ضرور

---

[1] آجکل ابوالکلام نمبر۔ صفحہ ۱۹۔

اس کی بہ ہمی بقول نیاز فتحپوری ''نہ جارحانہ تھی نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا سا تھا جو روٹھتا ہے، صرف منائے جانے کی توقع پر[1]'' یہ سچ ہے کہ خود الہلال کا بہت بڑا حصہ عثمانیت سے بھرا ہوا ہے اور ناموران غزوۂ طرابلس پر مولانا کے قلم نے بھی کافی اشک فشانی کی ہے مگر ان کے ذہن میں یہ بات شروع ہی سے صاف تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے کسی بیرونی ملک افغانستان یا ترکی وغیرہ کی مدد پر بھروسہ کرنا ایک خیال خام ہے، اور قومی آزادی صرف قوم ہی کی کوشش سے مل سکتی ہے، اور اسی لئے انھوں نے الہلال کے ذریعہ یہ بھی کوشش کی کہ ملک میں اجتماعی حیثیت سے تمام فرقوں کے درمیان ایک مشترک جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و ملت کے اختلافات کو کم کیا جائے تاکہ آزادی وطن کے محاذ پر سب متفق و متحد ہو جائیں انھوں نے طرابلس و بلقان کے مسائل اور ترکی کی داخلی کشاکش پر جہاں زوردار لہجے میں گفتگو کی وہیں ملک کے داخلی مسائل خصوصیت کے ساتھ مسجد کانپور کے اوپر بھی اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا'' اور اس ذہنی کرب اور جسمانی مصیبت کو واضح اور روشن انداز میں قارئین کے سامنے رکھ دیا، جو ایک غلام قوم کو حاکم قوم کے ہاتھوں برداشت کرنا ہوتی ہیں'' مولانا نے اس رمز کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ذہن تک مذہب کی راہ سے زیادہ موثر انداز میں پہونچ سکتے ہیں'' انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانان عالم پر جو تنزل اور ادبار چھایا ہوا ہے اس کا سبب مذہبی جہالت بھی ہے اور اسی لئے انھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد دعوت قرار دی اور قرآن مجید

---

[1] آجکل۔ ابوالکلام نمبر۔ صفحہ ۲۰۔

کے حقائق و معارف پر مقتضیات حالیہ کے مطابق درس دینا شروع کر دیا
۱۱ر اگست ۱۹۱۲ء کے شذرات میں الہلال نے ہماری توجہ اس جانب
مبذول کرائی کہ ایڈیٹوریل نوٹس کے علاوہ ایک باب جو مذاکرۂ علمیہ کا ہے
"اس کے نیچے (مولانا) علمی اور مذہبی تحقیقات کے مضامین ایک خاص
اصول و رنگ کے درج کرنا چاہتے ہیں، علی الخصوص ان غلط فہمیوں کی نسبت
جنھوں نے برسوں سے قرآن و حدیث کے اصل حقائق و معارف پر
پردے ڈال دیے ہیں" چنانچہ انھوں نے اس بات کا بار بار اعادہ
بھی کیا کہ مسلمانوں کے پولٹیکل نصب العین کو بھی قرآن کریم سے ماخوذ ہونا
چاہیے اور ان کو اس راہ میں بھی از روئے مذہب قدم رکھنا چاہیے" نہ کہ
بر اتباع حریت جدیدہ یورپ و تقلید اخوان وطن" انھوں نے یہ بتلایا کہ
اسلام اور قومیت ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ مجموعی قومی مفاد کا تصور
اسلامی تصورات کے عین مطابق ہے اور مذہب کا حقیقی تصور ایک سیکولر حکومت
کی تشکیل کی دعوت اس لئے دیتا ہے کہ ایک مذہب کے ماننے والے
دوسرے مذہب کے پیروؤں پر ظلم نہ کر سکیں وہ بحیثیت مسلمان کے
اسلام کی آفاقی تعلیمات اور حیات آفریں دعوت کا عشر عشیر چھوڑنے پر
تیار نہ تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ہونے کے ناتے وہ
ہندوستان کی ساری تہذیبی میراث کے وارث بھی رہنا چاہتے تھے،
مذہب و قومیت کا یہ متوازن امتزاج جو سیاسی حقوق طلبی میں برادران
وطن کے ساتھ بے خوفی، برابری اور اعتماد کا سبق دیتا ہے، مولانا نے
الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر عام کیا اور ملک میں بسنے والی دیگر
قوموں کے ساتھ ایک باعزت اشتراک کی دعوت دی، مولانا کے

اس نقطۂ نظر میں نہ مذہبی دیوانگی تھی نہ مذہب کی آڑ، بلکہ اس کے پیچھے مذہب کی وہ حقیقی روح کارفرما تھی جو تشکیک و تذبذب اور کفر و الحاد کی وادیاں طے کرنے کے بعد انھوں نے حاصل کی تھی۔

الہلال بند ہو جانے کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا یا اس کے بہت دنوں بعد دوبارہ الہلال نکالا تو اس کی منزلِ مقصود بھی وہی تھی جو الہلال کی تھی، اگر کچھ فرق تھا تو وہ محض طریق ابلاغ کا تھا، نفسیات عملی کی تہذیب و تربیت کے ساتھ ساتھ اب مولانا نے نفسیات ذہنی کی طرف بھی اپنا رُخ موڑ دیا تھا، اور حرکت و عمل جوش و ولولہ کے ساتھ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کی تدریس و تلقین بھی شروع کر دی تھی، خونِ منصور کی شعلہ آہنگی اب ایک بشارتِ رحمانی اور پیام طاغوتیت شکن میں تبدیل ہو چکی تھی پردۂ کتاں چاک ہو چکا تھا اور نظارۂ ماہ کے لئے لوگوں کو تیار کرنا باقی رہ گیا تھا، ابتدائی دور کے الہلال نے ملک کے سیاسی، علمی، ادبی اور مذہبی افکار و عقاید پر اپنے نقوش مرتب کر دیئے تھے، اور ۱۹۱۹ء کے بعد جو اجتماعی ذہنیت ظہور پذیر ہوئی تھی ان کے اندر وہ عناصر و مبادیات کارفرما تھے جن کی تبلیغ الہلال نے کی تھی، مذہب، سیاست، ادبیات، علوم و فنون اور معلومات عامہ اور اس کے دیگر ابواب پر مولانا کی انفرادیت اور مجتہدانہ زاویۂ نگاہ کے اثرات ....

....

پچھلی حرکت کے ردِ عمل کی شکل میں ظاہر ہو چکے تھے، وہ اب خصوصیت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی قومی و اجتماعی ذہنیت کی تشکیل اور اس کے اہم مباحث پر لکھنا چاہتے تھے، یہ سچ ہے کہ آخری دور کے الہلال نے ان تمام

دعووں کو خاطر خواہ پورا نہ کیا، جو مولانا بار بار دہراتے رہے، اور اب اس کی ترتیب میں وہ جوش و خروش بھی باقی نہ رہ گیا تھا، جو ابتدائی دور میں پایا جاتا تھا مگر اس کے باوجود مولانا نے صحافت کے اصولوں کو جس سلیقے اور حسن کے ساتھ برتا، اور ملکی و ملی مسائل پر جس بے لاگ اور حقیقت پسندانہ انداز میں غور و فکر کی دعوت دی وہ کسی دوسرے معاصر اخبار یا رسالہ سے نہ ہو سکا اختلافی مسائل میں حریت فکر اور جرأت مندی، دینی مسائل پر معقول نقطۂ نظر اور سائنٹفک صحافت کے اصول و ضوابط کو جس انداز میں مولانا نے اپنایا اور طباعت و ترتیب اور تصاویر کے اندراج کا جو اہتمام و انصرام انھوں نے کیا وہ اردو صحافت میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ اسی فعال جریدہ کا کارنامہ تھا کہ نہ صرف اردو ادب پر بلکہ ملک کی قومی اور ملی تحریکات پر اس کی پرچھائیاں پڑیں، اور اس ایک چراغ سے فکر و فن کے بہت سے نگار خانے منور ہو گئے، جماعت اسلامی کا وہ رنگ و آہنگ جو برصغیر ہند و پاک میں آج ہر شخص محسوس کر رہا ہے اس پر مولانا کی شرمندۂ تعبیر نہ ہونے والی "حزب اللہ"، کے ان بنیادی اصول و ضوابط کا عکس دیکھا جا سکتا ہے جن کی تبلیغ انھوں نے اپنے اسی پرچہ کے کچھ شماروں میں کی تھی۔

آج جماعت اسلامی کی مذہبی اور سیاسی نوعیت میں اس کے ماننے والے اور اس کے مخالف تضاد و ہم آہنگی کی بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن باوجود اس کے کہ حزب اللہ محض ایک دینی جماعت کا تصور لے کر صفحۂ قرطاس پر آئی تھی، جب ہم مولانا کے اس بنیادی نظریہ پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ مسلمانوں کی اسلامی اور وطنی زندگی کے فرائض میں ہم آہنگی اور وحدت کا احساس موجود ہے تو ہمیں کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا

کہ مودودی صاحب کی تحریک جزوی اختلافات کے باوجود، بنیادی طور پر اسی آواز کی بازگشت ہے جو کسی زمانے میں الہلال کے ذریعہ مولانا نے بلند کی تھی، اور جماعت اسلامی ہی کیا ملک کے اندر دیگر کام کرنے والی تبلیغی جماعتیں اور ان کا لائحہ عمل ہو تو ہو بہو "حزب اللہ" سے مستعار معلوم ہوتا ہے، مولانا الیاس کی تبلیغی جماعت جس کے ماننے والے آج دنیا کے مختلف ممالک میں تبلیغی گروہ بنا کر دورہ کر رہے ہیں اور اپنے دینی معمولات، اور روابط سے مختلف قوموں کو متاثر کر رہے ہیں، اس پر بھی مولانا کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں، جمعیۃ العلماء سے تو خیر مولانا کا براہِ راست تعلق رہا لیکن اس کے علاوہ خلافت تحریک، اور خاکسار، عبید اللہ سندھی کی تحریک وغیرہ جہاں کچھ اور سرچشموں سے فیض یاب ہو رہی تھیں وہیں الہلال کی تعلیمات نے بھی ان پر اثرات ڈالے تھے، اور ان کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی تھی، اور صرف یہی نہیں بلکہ جس بے پناہ اخلاقی جرأت کے ساتھ کسی خوف یا مصلحت اندیشی کے بغیر الہلال نے بات کی اور بات کہنا سکھلایا اور حق دوستی اور حق پرستی کے شدید جذبہ کو قوتِ محرکہ میں تبدیل کیا وہ نہ صرف اردو ادب میں ایک روایت بن گیا ہے بلکہ اس کی مثال مولانا کے قبل کسی دوسرے ادیب کے یہاں نہیں ملتی۔

تذکرہ

تذکرہ میں ان افکار و عوامل کا تفصیلی جائزہ لیا جا سکتا ہے جو مولانا ابوالکلام کو ورثہ میں اپنے آبا و اجداد سے ملے تھے، حق گوئی، حق شناسی، خطابت، قوت حافظہ، اعلائے کلمۃ الحق، تحمل، بردباری، نفاست طبع، سحر خیزی، اور اسی طرح کی وہ تمام دیگر خصوصیات جو ان کی شخصیت میں ہم کو نظر آتی ہیں ان سب کا

رشتہ و دور نزدیک کہیں نہ کہیں ان چلتی پھرتی تصویروں سے ملتا ہے جن کے حالاتِ زندگی سے مولانا نے اس مرقع کو سجایا ہے۔ یہ کتاب محض چند نفوس کے حالاتِ زندگی کی دستاویز نہیں ہے، بلکہ مولانا کی افتادِ طبع کو سمجھنے کا ایک اشاریہ ہے، انھوں نے اپنے کرداروں کی داستانِ حیات کے ان پہلوؤں پر گہری رنگ آمیزی کی ہے جو خود ان کے مزاج اور ماحول سے مطابقت رکھتی تھیں، اور بڑی سختی کے ساتھ ان علمائے سوء پر تنقید کی ہے جو چراغِ مصطفوی اور شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری میں دنیاوی دولت و حشمت کے لئے جادۂ حق سے انحراف کر گئے، اور صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کے لئے کانٹوں کا فرش بچھا دیا۔

رانچی کی نظر بندی کا کچھ زمانہ، جو آزادیٔ وطن کی جد و جہد کا انعام تھا، یقیناً ان اکابرین کی داستانِ حیات مرتب کرنے میں سکون کا باعث ہوا ہوگا، جن سے مولانا کے خاندانی اور ذہنی رشتے ملتے تھے اور جنھوں نے باطل کی طاقتوں کے سامنے کبھی اپنا سر نہ جھکایا، اور راہِ حق میں طرح طرح کے مصائب برداشت کئے، انھیں کی زندگی کے واقعات سے مولانا کو عقیدہ کی پختگی، اور عشق مقاصد میں مصائب جھیل جانے کی قوت عطا کی تھی اور شاید جذباتی ہم آہنگی کی یہی مقناطیسی کشش تھی جس نے مولانا کو ان لوگوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ جن سے وہ براہ راست خاندانی طور پر منسلک تھے، ان لوگوں کے بھی تفصیلی تذکرہ پر آمادہ کیا جو متعلقہ ادوار میں کم و بیش اسی طرح کے حالات میں گھرے تھے، جو خود مولانا کے سامنے درپیش تھے جس طرح سے اسلاف طاغوتی طاقتوں کے سامنے ڈٹے گئے

خود اسی طرح مولانا نے بھی اپنے کو برطانوی استحصال کا مدمقابل بنایا، اور اندیشہ ہائے دور و دراز میں گرفتار ہوئے بغیر سچائی کا ساتھ دیا، اسی سرچشمہ سے انھوں نے ہمت و جرأت، عزم و حوصلہ حاصل کیا تھا اور اسی لئے زندگی کی کٹھن سے کٹھن منزلوں میں بھی ان کا لہجہ غیر متزلزل رہا، اور ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور کچھ برسوں کے بعد جب ۱۱ جنوری ۱۹۲۲ء کو پریزیڈنسی جیل علی پور میں عدالت کے لئے انھوں نے اپنا بیان مرتب کیا تو اظہار حق میں اپنے آپ کو اتنا نڈر اور بے باک ثابت کیا جس کی مثال عدالتوں کی تاریخ میں کم ملتی ہے ان کے لہجے کی مضبوطی، یکسوئی اور قطعیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ قید بامشقت کی سزا سننے کے بعد انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ تو اس سے بہت کم ہے جس کی مجھے توقع تھی[1]"۔

یہ بے لاگ اور خالص صداقت، شجاعت اور استقامت جو زندگی کے ہر ہر مرحلے میں مولانا کے ساتھ رہی، اسی "دعوت و عزیمت" کے تصور کا نتیجہ تھی جن سے مولانا نے تذکرہ کے صفحات کو مزین کیا ہے، امام حسینؓ، امام مالکؒ، امام حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ اور خود ذاتِ نبوی کی طرف مولانا کی والہانہ کشش محض ایک رومانی تعلق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ایک عالم دین کی حیثیت سے ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ مسلمانوں کا انحطاط پذیر معاشرہ انھیں ارباب صدق و صفا کی زندگی سے فیض حاصل کر کے اگر عظمت کی راہ نکالے تو اس کی نجات ممکن ہے مگر

---

[1] قول فیصل، صفحہ ۱۲۳ - نیا ادارہ دہلی -

نئی راہوں کا یہ تصور تقلید جامد کی چہار دیواری میں پروان نہیں چڑھ سکتا، بلکہ کتاب و سنت کو مرکز حق و یقین بنا کر حالات کے مطابق آگے بڑھنا پڑے گا۔ یہ ضرور دھیان میں رکھنا پڑے گا کہ یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا سب کو اس کی خاطر اپنی جگہ سے ہل جانا پڑے گا، اس چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا، سب چوکھٹیں اسی کی خاطر چھوڑ دینی پڑینگی۔ ہم کو یہ کرنا ہوگا کہ ارشاد نبوی یا فرمان الٰہی کو علیٰ حالہٖ قائم رکھیں اور بقیہ لوگوں کے اقوال میں ترک و اخذ سے کام لیں، مولانا کے نزدیک بزرگوں کو مسلکِ تنقید سے بالاتر سمجھنا اور ان کے اقوال و احوال کو بمنزلہ اصل مرکز بنا لینا شدید افراط اور غلو فی الدین میں داخل ہے صرف قرآن اور ذاتِ نبوی لوح محفوظ ہے جس کے ذکر کو خود قرآن نے اپنی آغوش حفظ و حیانت میں ہمیشہ کے لئے لے رکھا ہے۔

تذکرہ کے آخری ابواب جہاں تشبیہہ و استعارہ کے دبیز پردے کے پیچھے خود مولانا کی اپنی شخصیت جھلتی پھرتی نظر آتی ہے، اردو ادب میں خاصہ کی چیز ہیں، اس میں مولانا نے اپنی رندی اور شاہد بازی کے بارے میں کم و بیش جو کچھ بھی لکھا ہے وہ نہ تو غیر فطری ہے نہ الہامی، اور نہ کوئی ایسی بات ہے جس پر تعجب کیا جائے، جن روشن دلان سلف کے آثار و مناقب کو مولانا نے ابواب کا پس منظر بنایا ہے۔ ان سے اکتساب فیض کرنے والا شخص حق گوئی کی دولت سے مالامال بھی ہو سکتا ہے اور ضبط و انقیاد کی زنجیریں بھی اس کے پیروں میں پڑ سکتی ہیں خصوصیت کے ساتھ جب اس کا منصب ایک داعی کا ہو اور ذکر اپنی "مسیہ رؤیوں" اور "سینہ بختیوں" کا۔ اس عالم میں رموز و علائم ہی کی دنیا سجائی جا سکتی ہے

لوگ عموماً بادۂ وساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو اور قدوگیسو کی اصطلاح میں دار ورسن کا تذکرہ چھیڑتے ہیں، مولانا کی انفرادیت مشاہدۂ حق کی آڑ میں بادہ وساغر، اور دار ورسن کے پردے میں قد وگیسو کی داستان مرتب کرتی ہے، اس کے علاوہ ایک شخص جو داعی بھی ہو اور جسے اظہار حقیقت بھی کرنا ہو، کر ہی کیا سکتا ہے، وہ خود پردے کے پیچھے رہتا ہے اور اپنی پرچھائیں کو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے کر دیتا ہے، ان فصلوں میں یہی مولانا کا آرٹ ہے، اور یہ آرٹ اردو ادب میں اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ اس میں نہ صرف مولانا کا اندازِ فکر واضح ہوتا ہے بلکہ ان کا زورِ بیان، ان کی اشاریت، ان کی روحانی قوت بھی کا اظہار خاطر خواہ ہو جاتا ہے، مجموعی طور پر یہ کتاب خود نوشت سوانح حیات سے زیادہ دوسروں کی سوانح عمری اور سوانح عمری سے زیادہ مذہبی اور اخلاقی مسائل کا ایک پرجوش مذاکرہ ہے جو حمایت حق کے لئے لکھا گیا ہے اس میں مولانا نے جابجا غلو سے بھی کام لیا ہے اور اس غلو کا مقصد محض یہ ہے کہ موضوع کی وضاحت زیادہ موثر انداز میں ہو سکے اور ناظرین کو زیادہ سے زیادہ مسحور کیا جا سکے، اگر یہ کتاب دل جمعی اور فراغ خاطر کے ساتھ لکھی جاتی تو شاید اس بے ساختہ آمد کا گلا گھٹ جاتا جو ناشر کی دستبرد سے محفوظ نہ ہونے کے باوجود بھی اس کتاب میں پائی جاتی ہے، اُن کا روئے سخن بظاہر تو اسلاف کی داستانِ حیات کی طرف ہے، مگر حقیقتاً وہ اپنے تزکیۂ نفس کے ساتھ ساتھ ان عوام کے جذبات کی تہذیب و ترتیب کر رہے تھے جنھیں برطانوی استبداد کے مدّ مقابل ہونا تھا اور اسی بنا پر شاعرانہ

سحر طرازیوں کے ساتھ تذکرہ میں ڈرامائی عناصر اور خطیبانہ انداز دو
اپنی انتہائی بلندیوں پر پہونچے ہوئے ہیں۔

قول فیصل

تذکرہ کے انطباع کے تقریباً سوا دو سال بعد مولانا کا وہ
جو ۱۱ر جنوری ۱۹۲۳ء کو عدالت میں داخل کرنے کے
انھوں نے پریزیڈنسی جیل علی پور کلکتہ میں مکمل کیا اور جو "قول فیصل" کے
سے طبع ہو کر مشہور ہو چکا ہے، ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کراتا ہے
شان کے علاوہ اس کا پرجوش، غیر متزلزل اور غیر استشنا طلب لب لہجہ
مولانا کی بے خوفی، جرأت و ہمت کا شاہد ہے، بلکہ سننے والوں اور پڑھنے وا
کے دلوں میں بھی مصائب اور خطرات کے درمیان اعلان حق کا حو
پیدا کرتا ہے اور دار و رسن کی منزلوں کو رقصاں و غزل خواں طے
کا عزم سکھلاتا ہے، بظاہر تو اس کا مخاطب ایک مجسٹریٹ ہے مگر د
یہ تمام قوم کے نام ایک خطبہ ہے، یہ وہی سبق ہے جو تذکرہ کے
کردار اپنے ماحول اور اپنے زمانے میں دہراتے رہے تھے اور اس
بعد مولانا خود اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہونے لگتے ہیں، حق و
آویزش کا وہ ڈرامہ جس کا نقطۂ عروج مختلف ادوار کی عدالت
نمایاں ہوا اس کے ایک منظر کا مرکزی کردار خود مولانا بن جا
اور ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ مسیح، سقراط، گلیلیو کی صف میں
بھی کھڑے ہو گئے ہیں اور ان کا دل سرور و نشاط سے لبریز ہو گیا
ہندوستان کی بیوروکریسی، آزادی اور انصاف کی جدوجہد کو
رکھنا چاہتی ہے، قومی بیداری اپنی نشوونما کے لئے کھلی فضا
کرتی ہے۔ تنازع للبقا کی اس جنگ میں مولانا کا وجود حق و

کی ایک علامت بن جاتا ہے، اس لئے کہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے، اس کی پامالی انسانیت کا قتل عام ہے، اس کی مدافعت ضروری ہے، انسانوں کی بنائی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے،" محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لئے جائیں لیکن وہ غلامی ہی ہے، اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔"

مولانا کے اس نظریئے کا سرچشمہ کتاب اللہ کی وہی تعلیمات ہیں جن کا اعادہ بار بار الہلال کے صفحات میں ہو چکا ہے، اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرسکتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو، وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ہے جو نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لئے آیا تھا، وہ مسلم بیوروکریسی کو بھی ظلم اور غیر منصفانہ تصور کرتا ہے، مسلمان خدا کی زمین پر "شاہد" یعنی سچائی کی گواہی دینے والے ہیں، بہ حیثیت ایک قوم کے ان کا یہی فرض ہے کہ خدا کی طرف سے سچائی کے گواہ رہیں، کتمان شہادت ان کا مسلک نہیں، ان کی گذشتہ تاریخ بتلاتی ہے کہ ان کی زبانیں خود ان کی اپنی حکومتوں میں سچی بات کے اعلان کے لئے آزاد رہیں، دارالخلافت کی ایک بڑھیا عورت خلیفہ وقت سے برسرعام کہہ سکتی تھی "اگر تم انصاف نہ کرو گے تو تکلے کی طرح تمہارے بل نکال دیں گے"، عین جمعہ کے مجمع میں منبر پر خطبہ دیتے ہوئے خلیفہ سے ایک شخص کھڑا ہو کر کہہ سکتا تھا "نہ تو سنیں گے نہ اطاعت کریں گے اس لئے کہ تمہارے جسم پر جو جبہ ہے وہ تمہارے

حصہ کے کپڑے سے زیادہ کا بنا ہوا ہے اور یہ خیانت ہے"
تو پھر ایک غیر ملکی حکومت کے دور میں مسلمانوں کے فرائض اور
بڑھ جاتے ہیں، آزادی کی راہ میں قربانی و جاں فروشی ان کا
قدیم اسلامی ورثہ ہے، اس لئے جب برطانوی حکومت مسلم خلافت کو
پامال کر رہی ہو تو وہ ایک فریق محارب کی حیثیت رکھتی ہے اور
حق و انصاف کا تقاضا ہے کہ سوراج کا حصول ہو، یعنی ایسی گورنمنٹ
کا حصول، جو ہندوستانیوں کی ہو، ہندوستان میں ہو اور
ہندوستان کے لئے ہو[1]"

مولانا کا یہ تاریخی بیان اپنے طریق استدلال، اور یقین محکم کی
بنا پر ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے، شب ظلم اور نرغۂ راہزن میں ایک
شخص قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح حق و انصاف کی مشعل جلائے
دشمنوں کے قلعہ پر رجز پڑھتا ہوا بغیر کسی جھجک کے بڑھتا چلا آتا ہے، وہ
مستقبل قریب کے خطرات سے واقف ہے مگر مستقبل بعید اور حق کی آخری
فتح پر اسے اعتماد کلی اور یقین کامل ہے:

"مسٹر مجسٹریٹ! اب اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا، یہ تاریخ کا
ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں
یکساں طور پر مشغول ہیں، ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے تمہارے
حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی ہے، میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے
لئے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا، آؤ

---

[1] قول فیصل۔ صفحہ ۱۰۱

اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں، مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے، ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو، ابھی کچھ دنوں یہ کام جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے، یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے، وقت اس کا جج ہے، وہ فیصلہ لکھے گا، اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔"[1]

ترجمان القرآن

ترجمان القرآن مولانا کے فکر اور فن دونوں کا شاہکار ہے، ہر چند کہ اس کا اسلوب وہ نہیں ہے جو ابوالکلام کے تصور کے ساتھ ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا لیکن وسعت نظر و مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق مولانا کی اجتہاد فکر کے ساتھ اس قدر گھل مل گیا ہے اور اس نے اپنے اظہار کے لئے ایسے اسلوب بیان کا وسیلہ تلاش کر لیا ہے جو سادہ ہوتے ہوئے بھی پرکار اور سلیس ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر توانائی رکھتا ہے، اس میں اگر ایک طرف یہ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کی تفسیر کو تاویلات و توجیہات کی پرخار وادیوں سے بچایا جائے تاکہ وہ محض فقہی اور کلامی بحثوں کا پشتارہ نہ بن جائے تو دوسری طرف یہ بھی ہوا ہے کہ ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اور قاری کے ذہن میں بغیر کسی تشویش و اضطراب کے اتر تا جائے، مولانا کے قبل اور ان کے بعد عموماً جو تفسیریں لکھی گئی ہیں

---

[1] قول فیصل۔ صفحہ ۱۰۲۔

ان میں وضعیت یا ضاعیت پائی جاتی ہے، مفسرین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ فقہ یا علم کلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش کریں اس کے علاوہ ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو تطبیق عقل و نقل کے اتنے پرجوش شیدا ہیں کہ جدید سائنسی علوم و فنون کی نت نئی ترقیوں اور خرد کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے نظریات کے زیر اثر قرآن کے مفہوم میں بھی تبدیلیاں کرتے ہیں یہ زبردستی کی کھونس ٹھانس وضعیت اور رضاعیت قرآن کی سادگی اور فطرت کے بالکل خلاف ہے مولانا نے اپنے دامن کو ان دونوں چیزوں سے بچایا ہے اور عقل کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے قرآن کے عام طریقہ استدلال کی بنیاد وجدان پر رکھ کر اسے ہر معیار ذہن و عقل کے انسان کے لئے قابل قبول بنا دیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ ان مقامات پر جہاں تحقیقی چھان بین اور تاریخی تلاش و جستجو کا مرحلہ در پیش ہوا ہے وہاں پر انھوں نے سائنٹفک طریقۂ استدلال کا بھی حق ادا کر دیا ہے، انھوں نے فروعی باتوں پر زیادہ قوت صرف کئے بغیر قرآن کی بنیادی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور ان باتوں کو خصوصیت کے ساتھ اجاگر کیا ہے جن کا تعلق عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے، رنگ و نسل کے امتیازات اور جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر انھوں نے انسانیت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو خدا پرستی کے مقدس رشتے میں یکجا کرنے اور قرآن کے اس سبق کو عام کرنے پر زیادہ زور دیا ہے کہ سارے انسان ایک ہی رب العالمین کی عیال ہیں، اور تمامی نسل انسانی ان کا گھرانا، اور ساری دنیا ان کا وطن ہے، ایک ایسی دنیا میں جبکہ رشتہ انسانیت کی وحدت سیکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی ہو، سیکڑوں نسلیں، سیکڑوں وطن ایک

دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہوں، رنگوں کا تعدد باہمی نفرت و عناد
ایک بڑا ذریعہ بن گیا ہو۔ امیر و فقیر، نوکر و آقا، وضیع و شریف
ضعیف و قوی، ادنیٰ و اعلیٰ کے بے شمار اختلافات نے دنیا کے سکھ اور
چین کو غارت کر دیا ہو، مولانا نے خدا پرستی کو بنیاد بنا کر وحدتِ ادیان
کا جو ترانہ چھیڑا اور قرآن کے ذریعہ تمام مذاہب عالم کی جو باہم دگر
تصدیق کی، ان میں انسانی جمعیت کی فلاح و سعادت کے جو امکانات
مضمر تھے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مذہبی تصور کی یہ
نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لئے ایک ایسا سانچہ مہیا کرتی ہے
جس میں ڈھل کر نکلنے کے بعد انسان کی خدا پرستی نہ صرف خدا کی عالم گیر
رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی بلکہ انسان عالم گیر انسانیت کا
انسان ہوگا، مولانا کے نزدیک دعوتِ قرآنی کی اصل روح یہی ہے۔ اور
ترجمان القرآن کے یہی وہ مباحث ہیں جہاں مولانا کے قلم نے وسعت فکر
و نظر کا حق ادا کر دیا ہے، وحدت ادیان، دوسرے مذاہب کی الہامی
کتابوں کی تصدیق، شریعت و منہاج کا فرق، دین اور شریعت کا باہمی تعلق،
دیگر مذاہب کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر، انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود
کے مسائل، یہ وہ مقامات ہیں جہاں مولانا نے فکر و فن کے وہ چراغ روشن
کر دئے ہیں جن کی روشنی جنگ و تباہی کی ماری ہوئی اس دنیا کو
سکون عطا کرتی رہے گی، ان کا ذہنی اور جذباتی الحاق بقول خواجہ غلام السیدین
"ایک عالمگیر تصورِ انسانیت کے ساتھ تھا، وہ ہر مسئلہ کو ایک انسانی مسئلہ
سمجھتے تھے، اور خیر و شر کو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ایک ناقابل تقسیم میراث"[1]

---

[1] آندھی میں چراغ، صفحہ ۹۹ انڈین اکیڈمی نئی دہلی مارچ ۱۹۶۳ء

ان کے نزدیک سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے جو خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں، جو نسلوں، قوموں اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے، بلکہ رب العالمین کی حمد ہے جو تمام کائنات و خلقت کا پروردگار ہے مولانا کے ان تصورات میں نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں نہیں نظر آتی۔ جب مرد مومن خدا کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے تو وہ ایک سیدھے اور سچے راستے پر چلنے کی دعا مانگتا ہے جو تاریخ انسانی میں سچ کے سبھی ماننے والوں کا مشترک راستہ رہا ہے، نہ کسی خاص قوم یا گروہ کا، اسی طرح جب وہ ظلم اور برائی کے راستے سے پناہ مانگتا ہے تو بھی کسی خاص جماعت یا نسل کے راستے سے نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے راستے سے جنھوں نے سچائی سے منھ موڑا اور گمراہی کے دلدل میں جا پھنسے۔

ترجمان القرآن کی تخلیق کے پیچھے وہ تمام عوامل و افکار کارفرما تھے، جن سے مولانا کی فکر کا خمیر اٹھا تھا، علم حدیث و سنت کی جاگیری کا ورثہ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد سے پایا تھا، جمال الدین افغانی، عبدہٗ اور رشید رضا کی تحریروں کے ساتھ ساتھ سر سید احمد خاں کے افکار و خیالات نے انھیں اس فکری اور ذہنی انقلاب سے بھی آشنا کر دیا تھا جو انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں تمام عالم اسلام کے اندر پیدا ہو رہا تھا، بذاتِ خود مولانا نے شک و شبہات کی منزلوں سے گذرنے کے بعد روایتی اور تقلیدی اسلام کے بجائے فکر اور عقل کی کسوٹی پر اترنے والے اسلام کو قبول کیا تھا، غیر مسلموں کے ساتھ مناظرہ کرنے کی بنا پر دوسرے

مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ بھی وہ تحقیقی اور تنقیدی نگاہوں سے کر چکے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم وفنون کا بیشتر ترکہ جو ابتدائی اسلامی دَور سے ان کے عہد تک صاحبانِ فکر و عمل نے چھوڑا تھا ان کی نگاہوں سے گذر چکا تھا، ابن تیمیہ اور ابن قیم کے افکار، خود ہندوستان کے اندر شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا محمود الحسن تک چلنے والی ساری تحریکات، اور دیگر متعلقہ امور و مسائل کا خاکہ ان کے حافظہ میں موجود تھا اور یہی نہیں بلکہ خود مولانا کے اندر اجتہاد فکر و نظر کی کمی نہ تھی، دنیا کے عام تمدنی حالات اور علوم جدیدہ کی ترقی نے لوگوں کے ذہن و خیال میں جو وسعت پیدا کر دی تھی اور جدید و قدیم کی جو کشمکش پیدا ہو چلی تھی اس سے بھی مولانا خاطر خواہ واقف تھے، مادری زبان عربی ہونے کی وجہ سے وہ ان نکات اور رموز کو بھی سمجھتے تھے، جو عربی لغت اور محاورات سے متعلق ہیں، چنانچہ تفسیر کے سلسلہ میں اسرائیلی روایات کے خرافات کو چھانٹتے ہوئے جب انھوں نے عقل کے ساتھ وجدان کو بنیاد بنا کر اسلام کو اس کے اصلی اور فطری مفہوم میں پیش کرنے کی کوشش کی تو وہ لوگ جو گذشتہ کئی صدیوں سے تقلید محض اور جمود ذہنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، پریشان ہو گئے اور انھوں نے اعتراضات شروع کر دیئے، ان کے دماغوں پر فقہی مکاتب خیال کا غلبہ اس قدر زیادہ تھا کہ وہ فقہ و کلام کی فرقہ بندیوں سے بالاتر ہو کر قرآن کا مطالعہ نہ کر سکتے تھے، اور اسی لئے انھوں نے یہ اعتراض کیا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے، حالانکہ مولانا نے خود اپنی تفسیر کے ماخذ کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ صحابہ و تابعین کی روایات، بعد کے مفسرین کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہیں، مولانا کے نزدیک تفسیر بالرائے کی ممانعت کا مقصود

یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ قرآن اوّل سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے، ان کے نظریہ کے مطابق تفسیر بالرائے سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ قرآن خود کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ متداول اور مروّجہ تفسیروں سے مولانا کو یہی شکایت تھی کہ ان کے مفسرین متعدد اقوال میں عموماً اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوتا ہے، اور جو بہتر قول موجود ہوتا ہے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں، چنانچہ مولانا نے اپنی تفسیر میں حقائق کی چھان بین اس طرح کی کہ قدیم نسل کی صلابت، جامعیت اور وضعداری کے نقش موجودہ دور کی تیز رفتار زندگی پر بھی جما دیئے، ان کا ترجمان ان کے صحیح معنی میں لبرل ہونے کا ثبوت ہے، بقول آل احمد سرور زندگی ان کے نزدیک سیاہ و سفید خانوں میں تقسیم نہ تھی، انھیں اس وسیع رقبے کا بھی احساس تھا جس میں سیاہی اور سفیدی مل جاتی ہے، وہ نوجوانوں سے بدظن نہ تھے، وہ نئے نظریوں سے بھڑکتے نہ تھے، انھیں اپنے اوپر اعتماد تھا اور انھیں دیکھ کر پرانے دیوزادوں کی نسل یاد آجاتی تھی، ان کے دم سے ہمارے ماضی کی بہت سی قدروں کا بھرم قائم تھا، انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ مکتبوں اور پاٹھ شالوں کی محدود فضا سے بھی زندگی کے چشمے اُبل سکتے ہیں[1]" ان کا یہ ادعا غلط نہ تھا کہ ترجمان لکھتے وقت انھوں نے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ پر وادیاں طے کی ہیں اسلام اور مسلمانوں

---

[1] ہماری زبان: امید ادب - آزاد نمبر - صفحہ ۱۱ - ۱۲

کی رنگا رنگ دینی، عقلی اور ادبی روایات سے ڈھل کر ترجمان میں قرآن کا فطری رنگ جھلکتا ہے، اس میں عقاید کی پختگی کے ساتھ وسیع المشربی اور وجدان کی لذتیں بھی ہیں جیسے ہندوستان ملک میں جہاں مذہبی دیوانگی اور مذہبی آرٹ، دونوں کی فراوانی میں حقیقی مذہبی جذبہ مفقود ہو گیا ہے، مولانا کا ترجمان وسیع المشربی، روشن خیالی اور وسعت فکر و نظر کا وہ شاہکار ہے جس میں تمام انسانیت ایک واحد اکائی کی صورت میں تبدیل ہو کر رنگ و نسل اور مذہبی و وطنی تعصبات کو ختم کر دیتی ہے اور یہ کوئی کم اہم کارنامہ نہیں ہے۔

غبار خاطر کی تصنیف و طباعت

غبار خاطر مولانا کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۳ اگست ۱۹۴۲ء اور ۳ ستمبر ۱۹۴۵ء کے درمیانی وقفہ میں وقتاً فوقتاً نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڈھ کے نام لکھے تھے یوں تو اس مجموعہ میں وہ دو خطوط بھی شامل کر دئے گئے ہیں جو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے مولانا کو لکھے تھے مگر ان کی حیثیت محض ضمنی اور ثانوی ہے نواب صاحب سے مولانا کا دوستانہ علاقہ بہت قدیم تھا۔ اجمل خاں کی روایت[1] کے مطابق مولانا کی پہلے پہل ان سے ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی، مگر خود مولانا کے ایک مکتوب کی روشنی میں یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا معلوم ہوتا ہے۔ ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء کے ایک مکتوب میں مولانا نے نواب صاحب کو لکھا ہے:-

"آپ سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی جب الندوہ کی ایڈیٹری

---

[1] اجمل خاں - مقدمہ غبار خاطر - صفحہ ۹

کے سلسلے میں وہاں مقیم تھا، ۱۹۰۵ء کی بات ہے، پورے پینتیس برس ہو گئے۔ اس وقت یاد آرہا ہے کہ آپ دیوان صائب کا ایک نسخہ عبدالحسین سے لینا چاہتے تھے، اس کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی، دہلی کا جلسہ ندوہ آپ کو یاد ہے؟ غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہوگی، مرحوم مولانا شبلی، آپ اور میں، مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھہرے تھے اور شب و روز صحبتیں رہتی تھیں، امین آباد لکھنؤ میں مولانا مرحوم کا بالاخانہ اور لیگ کے جلسہ کے موقع پر وہاں قیام، یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے، اٹھائیس برس ہو گئے۔ اس وقت سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو..... ۱۹۱۴ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں ٹھہرا تھا، آپ بھی دہلی آئے اور پانی پت کا بہ اتفاق سفر کیا، اس سفر کی صحبتوں کی ایک ایک بات اس وقت صفحۂ دماغ پر اُبھر رہی ہے، افسوس جتنے ہم نفس تھے ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے، وہ صحبتیں خواب و خیال ہو گئیں، اب برسوں گذر جاتے ہیں ایک متنفس بھی میسر نہیں آتا جس سے دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوق و طبیعت کی چار باتیں کر لوں، اب نہ زمانہ ہماری طبیعتوں کا متحمل ہے نہ ہم زمانے کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں۔[1]

نواب صاحب سے مولانا کا یہ رشتۂ اخلاص محض علمی اور ادبی ذوق کے اشتراک کی بنا پر تھا اور سیاسی عقاید و اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہ

---

[1] کاروانِ خیال۔ صفحہ ۶۰۔ ۶۱ مدینہ پریس بجنور۔

تھا اور مولانا کی زندگی کے مختلف ادوار میں فروعی اختلافات کے باوجود بھی قائم رہا، الہلال کے ابتدائی دور میں نواب صاحب کو مولانا کے مباحث کی وسعت اور لہجہ کی خشونت سے اختلاف پیدا ہوا اور انھوں نے ایک مراسلہ میں لکھا:۔

"آپ کو اپنا موضوع محدود کر لینا چاہئے، بحث کے واسطے مبحث کے تمام مالہٗ وما علیہ سے واقف ہونا اور بعد واقفیت غور و تامل لازم ہے۔ بدوں اس کے اگر رائے کا اظہار ہوگا، تحقیق کے پایہ سے گرا ہوگا۔"[1]

اور اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ الہلال کے لہجہ کی خشونت تعلیم ربانی کے مطابق نہیں ہے، مگر مولانا نے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے نواب صاحب کو "محبِ جلیل" کے نام سے یاد کیا اور یہ لکھا کہ شاید انھوں نے الہلال کی دعوت کا غور سے مطالعہ نہیں کیا مگر ان چھوٹے چھوٹے اور ضمنی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کی محبت دونوں کے دلوں میں باقی رہی، اور مولانا نے سیاسی معاملات کو بالائے طاق رکھ کر ذاتی محبت وا خلاص اور مشترکہ ذوقِ علم و ادب تک ان سے اپنے تعلقات کو محدود رکھا، چنانچہ ۲۵ اگست ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں سیاسی معاملات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نواب صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"مجھے یہ قصہ نہیں چھیڑنا چاہئے، میری آپ کی مجلس آرائی ... افسانہ سرائی کے لئے نہیں ہوا کرتی، میری دکان سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی، لیکن آپ کے لئے کچھ نکالتا

---

[1] الہلال ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء [2] الہلال ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء

ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے[1]"

مکاتیب کا یہ مجموعہ مکتوب الیہ کے پاس مطبوعہ صورت میں پہونچا، خطوط نویسی کی تاریخ میں یہ دل چسپ واقعہ کیوں اور کیسے رونما ہوا، اس کی تفصیل خود مولانا کی زبانی سنیئے، ۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو "نسیم باغ" سری نگر سے نواب صاحب کو خط لکھتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:۔

"گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام سے لکھ سکا تھا وہ ۳ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا، کلکتہ سے ممبئی جا رہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ ممبئی پہونچ کر اجمل خاں صاحب کے حوالے کر دوں گا، وہ نقل رکھ کر آپ کو بھیج دیں گے..... لیکن ممبئی پہونچتے ہی، کاموں کے ہجوم میں اس طرح کھو گیا کہ اجمل خاں صاحب کو خط دینا بھول گیا، ۹ر اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جا رہے تھے، تو بعض کاغذات رکھنے کے لئے راہ میں اٹاچی کیس کھولا، اور یکایک وہ خط سامنے آگیا، اب دنیا سے تمام علاقے منقطع ہو چکے تھے ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے..... قید خانے کے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے، اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا، کچھ معلوم نہ تھا کہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہ تک پہونچ بھی سکیں گے یا نہیں، تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح دل مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھا لینا تھا تو پھر

---

[1] غبارِ خاطر - صفحہ ۱۱۱

رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ...... ۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس کے بعد رُک گیا، کیونکہ ۹ر اپریل ۴۳ء کے حادثے (بیوی کے انتقال) کے بعد طبع داماندہ حال بھی رُک گئی تھی، ...... اس کے بعد گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی، اور رشتہ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں مگر اب سلسلہ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی، جس نے اوائل حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا، اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو ...... آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلم بند ہوا ہے۔ ۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے اس مکتوب پر یہ داستان بے ستون و کوہکن ختم ہو جاتی ہے۔"[1]

بانکوڑا سے مولانا ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے تو مولانا نے تمام مکتوب نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیے، مولانا لکھتے ہیں:۔

"خیال تھا کہ انھیں حسب معمول نقل کرنے کے لئے دے دوں گا اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مصر ہوئے کہ انھیں بلا تاخیر اشاعت کے لئے دے دینا چاہیئے چنانچہ ایک خوشنویس کو شملہ بلا لیا گیا ہے اور پورا مجموعہ کتابت کے لئے دے دیا گیا، اب کتابت ہو رہی ہے، امید ہے کہ عنقریب طباعت کے لئے پریس کے حوالے کر دیا جائے گا اب میں ان مکتوبات کو قلمی مکتوبات

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۳۲-۳۱-۳۰-

کی صورت میں نہیں بھیجوں گا، مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا"۔[1]

مولانا نے اس کتاب کا نام "غبارِ خاطر" میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کے رسالے "غبارِ خاطر" سے مستعار لیا ہے، اور اس بات کا اعتراف انھوں نے کتاب کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:-

"یہ تمام مکاتیب نج کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کئے جائیں گے"۔[2]

مولانا کا یہ بیان آثار و قرائن سے حقیقت پر مبنی نہیں معلوم ہوتا، اوّل تو یہی بات موضوع بحث بن سکتی ہے کہ آیا "غبارِ خاطر" کے مکاتیب پر "نج کے خطوط" کا اطلاق ہوتا بھی ہے یا نہیں، اور دوسرے مولانا کا یہ اصرار کہ سارے خطوط بغرض اشاعت نہیں لکھے گئے قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا، ان کے شعور اور لاشعور دونوں میں یہ بات واضح طور پر موجود تھی کہ جیل خانے سے نکلنے کے بعد یہ سارے خطوط شایع ہونگے اور صرف یہی خطوط نہیں بلکہ کچھ اور خطوط بھی جو انھوں نے ان کے قبل دوسرے لوگوں کو لکھے، ان کی اشاعت کے بھی امکانات ان پر واضح تھے، اور کسی حد تک وہ اس بات کے خواہاں بھی تھے کہ لوگ ان کے مکاتیب کو حفاظت کے ساتھ رکھیں، ۱۷ جون ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں وہ غلام رسول مہر کو لکھتے ہیں :-

"مجھے معلوم نہیں آپ میرے خطوط رکھتے ہیں یا ضایع ہو جاتے ہیں، بہرحال یہ خط سنبھال کر رکھ دیجئے، میری زندگی کا بڑا حصہ گذر چکا ہے، جو باقی ہے وہ بہت کم ہے، ممکن ہے کہ

---

[1] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۳ [2] دیباچہ غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۱۔

میں اس وقت تک نہ رہوں، لیکن یہ سطور باقی رہ سکتی ہیں[1]"۔
خصوصیت کے ساتھ "غبار خاطر" میں شامل خطوط کے متعلق تو مولانا شروع ہی سے محتاط تھے کہ وہ ضایع نہ ہوں، اور اسی لئے انھوں نے ان کی نقل رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ ۳ راگست ۱۹۴۲ء کا خط انھوں نے کلکتہ اور بمبئی کے درمیان ریل میں لکھا تھا مگر وہ محض اس وجہ سے پوسٹ نہ ہوسکا کہ ابھی اجمل خاں اس کی نقل نہ لے سکے تھے۔ پھر ۹ راگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو مولانا گرفتار کر لئے گئے اور جب وہ گرفتار کر کے احمد نگر لے جائے جا رہے تھے تو دوبارہ وہ خط سامنے آگیا، مگر "اب دنیا سے تمام علائق منقطع ہو چکے تھے، ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے[2]"۔ اس کے بعد دوران اسیری میں مولانا نے غبار خاطر کے دیگر خطوط لکھے۔ ۱۵ رجون ۱۹۴۵ء کو جب وہ رہا کئے گئے تو ان کے ذہن میں ان تمام مکتوبات کو پوسٹ کرنے کا خیال کس انداز میں پیدا ہوا، اس کی تفصیل مولانا کی زبانی سنئے:

"۱۵ رجون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا تو مکتوب نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دئے اور یہ جمع و ترتیب اس لئے کی گئی کہ اجمل خاں صاحب حسب معمول ان کی نقل رکھ کر اصل نواب صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیں، مگر جب مولوی اجمل خاں صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ اس بات کے لئے مصر نہیں ہوئے کہ یہ نج کے خطوط ہیں اس لئے فوراً مکتوب الیہ کے پاس روانہ کر دیئے جائیں

---

[1] نقش آزاد۔ صفحہ ۱۳۷ [2] غبار خاطر۔ صفحہ ۳۰ [3] غبار خاطر۔ صفحہ ۳۳۔

بلکہ ان کا اصرار ہوا کہ انھیں بلا تاخیر اشاعت کے لئے دے
دینا چاہیے"، مولانا نے ان کی رائے سے انفاق کیا۔ شملہ کانفرنس
کے مشغول اوقات میں جب کہ ہندوستان کے مستقبل کے
بنیادی فیصلے ہو رہے تھے" ایک خوش نویس کو بلالیا گیا اور
پورا مجموعہ کتابت کے لئے دے دیا گیا[1]" یہی نہیں بلکہ ان مکتوبات
کی نقلیں اخبار والوں کو بھی دے گئیں، مگر چونکہ یہ منطوط جو
اشاعت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے، اس کی کوئی نقل مکتوب الیہ
کے پاس روانہ نہیں کی گئی اور اس کو مطلع کیا گیا کہ ان مکتوبات
کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا"، مطبوعہ مجموعے
کی صورت میں پیش کروں گا[2]۔
چنانچہ یہ خطوط مکتوب الیہ کو مطبوعہ صورت میں اس وقت ملے جب وہ پورے ہندوستان
میں عام ہو چکے تھے، اور ایک کی نقل اشاعت کے لئے ایک اخبار کے ایڈیٹر
کو پہلے ہی دے دی گئی تھی، مولانا لکھتے ہیں:
"شملہ میں اخبار" مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے
انھوں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے اس سلسلے کے
پہلے مکتوبات کی نقل لے لی تھی وہ اخبارات میں شایع ہو گیا ہے شاید
آپ کی نظر سے گذرا ہو "صدیق مکرم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے
ہوں گے کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا[3]"
ان حالات کے پیش نظر مولانا کی یہ بات قابل قبول نہیں معلوم ہوتی کہ واقعی یہ

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۳۳ [2] غبار خاطر۔ صفحہ ۳۳

تمام مکاتیب نجی کے خطوط تھے اور اس خیال سے لکھے گئے تھے کہ شایع نہ کئے جائیں گے[2]" تذکرہ کی انطباع و اشاعت فضل الدین احمد کے سر گئی جن کی خواہش کی تعمیل مولانا کے پیش نظر تھی، "انطباع و اشاعت مقصود نہیں تھی[3]" اور غبار خاطر کے سلسلے میں اجمل خاں کا اصرار کام آیا جن کی طرح " ان کی خاطر بھی (مولانا کو) عزیز[4] تھی" "جمعیت خاطر کا وقت" مولانا کے الفاظ میں تذکرہ کے لئے بہم نہ ہو سکا اور غبار خاطر کے مکاتیب بھی "جس حالت میں قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے اسی حالت میں طباعت کے لئے دے دیئے گئے، نظر ثانی کا موقع نہیں ملا[5]" اصل قصہ یہ ہے کہ اس طرح کے بیانات مولانا کی نفسیات کے دل چسپ پہلو ہیں، اور انھیں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا دیباچہ نگار مل گیا ہے جس کے اصرار اور خیال کی خاطر آڑ میں وہ نہ صرف اپنے دل کی بات کہہ گئے ہیں بلکہ اس کے دیباچوں کی روشنی میں اپنی کسر نفس کا اظہار کر کے اپنی خوبیوں میں اضافہ کر گئے ہیں۔ فضل الدین اور عبد الرزاق ملیح آبادی سے لے کر اجمل خاں اور ہمایوں کبیر تک سب کے سب اپنے دیباچوں میں ایک پس منظر تیار کرتے ہیں جس میں ان کے اصرار اور مولانا کے کسر نفس اور انکار کی داستان دہرائی جاتی ہے اور بعد میں "خیال خاطر احباب" کے پیش نظر کتاب شایع ہو جاتی ہے اور مولانا نظر ثانی نہیں کر پاتے، ثبوت کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

---

[2] دیباچہ غبار خاطر۔ صفحہ ۲۱ [3] تذکرہ ۔ صفحہ ۳۲۶ ۔
[4] غبار خاطر۔ صفحہ ۲۱ [5] دیباچہ غبار خاطر۔ صفحہ ۲۱

فضل الدین احمد تذکرہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"۱۹۱۴ء میں جب الہلال کی شہرت کمال درجہ تک پہونچ چکی تھی اور ہر شخص اس عجیب و غریب شخصیت کے حالات معلوم کرنے کا خواہش مند تھا...... تو مجھے پہلی مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر ان کی زندگی کے حالات قلم بند ہو جائیں تو وہ کئی اعتباروں سے دل چسپ بلکہ نہایت نتیجہ خیز و مفید ہوں گے، چنانچہ میں نے یہ خیال ان پر ظاہر کیا لیکن انھوں نے...... صاف صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں...... ان کو چھوڑ کر میری زندگی کے حالات مرتّب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی..... گو انھوں نے انکار کر دیا لیکن میں نے اپنا اصرار برابر جاری رکھا...... بالآخر میں رانچی گیا اور مجبوراً ان کو اشاعت پر راضی ہونا پڑا۔"[1]

عبدالرزاق ملیح آبادی آزاد کی کہانی کی شانِ نزول کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں نے مولانا کو اکسانا شروع کیا کہ تذکرہ کی دوسری جلد لکھا دیں، ہفتوں میرے بھائی، میرے بھائی کہہ کر ٹالتے رہے مگر بھلا میں پیچھا چھوڑنے والا تھا، تقاضا جاری رکھا، آخر راضی ہو گئے، اور یہ کتاب لکھانا شروع کر دی۔"[2]

اجمل خاں غبارِ خاطر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"رہائی کے بعد مولانا نے قلعہ احمد نگر کے مکاتیب

---

[1] تذکرہ - صفحہ ۲۰ - ۱۹ - ۱۸   [2] آزاد کی کہانی - صفحہ ۱۹ - ۱۸ -

میرے حوالے کیے کہ حسب معمول ان کی نقل رکھ لوں.....
لیکن جب میں نے ان کا مطالعہ کیا تو خیال ہوا کہ ان تحریرات کا محض بخ کے خطوط کی شکل میں رہنا اور شائع نہ ہونا اردو ادب کی بڑی محرومی اور ارباب ذوق کی ناقابل تلافی حرمانی ہوگی، مولانا اس وقت شملہ میں تھے، میں نے بہ اصرار ان سے درخواست کی کہ ان مکاتیب کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دیں[1]"

ہمایوں کبیر "ہماری آزادی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"کچھ اوپر دو سال ہوئے جب میں نے مولانا آزاد کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ وہ اپنی سوانح عمری لکھیں، مولانا اپنی ذاتی زندگی کے حالات کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور پہلے انھوں نے ان کو بیان کرنے میں بہت تکلف کیا، انھوں نے اس بات کو بڑی مشکل سے مانا کہ انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اختیارات کی منتقلی کی جو کارروائی ہوئی اس میں ان کا بہت ممتاز حصہ تھا..... آخر میں جب میں نے ان کو یقین دلادیا کہ میں حتی الامکان انھیں اپنے ہاتھ سے لکھنے کی زحمت سے بچاؤں گا تو وہ راضی ہو گئے[2]"

ان میں دو کتابیں تذکرہ اور غبار خاطر مولانا کی زندگی میں شائع ہوئیں، چنانچہ دونوں کے مقدمات میں مولانا نے "خیال خاطر احباب" کے پیش نظر

---

[1] مقدمہ غبار خاطر۔ صفحہ ۱۵ [2] دیباچہ ہماری آزادی۔ صفحہ ۱۔

اشاعت کی اجازت، اور نظرثانی کا موقع فراہم نہ ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور دو کتابیں جو ان کے مرنے کے بعد شائع ہوئیں، ان میں سے ایک کے دیباچہ نگار نے وہی فرائض انجام دیے جو مولانا خود اپنی زندگی میں ادا کرتے، عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"مولانا اگر یہی کتاب اپنے قلم سے لکھتے یا اس پر نظرثانی کر لیتے تو اس کی شکل ضرور مختلف ہوتی"[۱]

البتہ آخری کتاب "ہماری آزادی"، چونکہ مولانا کی زبان میں نہیں ہے بلکہ اس کا ترجمہ ہے اور ایسے سیاسی مسائل سے متعلق ہے جن پر زاویہ نگاہ کے شدید اختلافات ممکن تھے، اس لئے مرتّب نے مسوّدہ کو مختلف تبدیلیوں اور کانٹ چھانٹ کے بعد بہرحال مولانا سے منظور کروا لیا تھا، خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، دیکھنا یہ ہے کہ غبارخاطر کی ادبی اہمیت کیا ہے۔

خط یا انشائیہ

اس سلسلے میں جو سب سے زیادہ اہم اور بنیادی سوال ہے وہ یہ ہے کہ مولانا کی یہ رائے کہاں تک درست ہے کہ غبارخاطر میں شامل مکاتیب "نج کے خطوط ہیں" اس لئے کہ جب تک اس بات کا تعیّن نہ ہو جائے کہ یہ نسخہ ہائے شوق ادب کی کس صنف کے تحت آتے ہیں، ان کے تفصیلی جائزے کا معیار مقرر نہ ہو سکے گا۔

مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے:

---

[۱] آزاد کی کہانی صفحہ ۲۲۔ [۲] تنقیدی اشارے۔ طبع دوم سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ صفحہ ۹۳۔

"خطوط ادبی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت و خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا، خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا"۔[1]

آل احمد سرور کے خیال میں "اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے، جس میں بے تکلفی، بے ساختگی خلوص، فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تاثرات کی جھلک ہو، چنانچہ وہ خط جن میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشاپردازی کی شان، تکلّف کا اظہار، خطابت کا جوش دکھایا جائے، خط نہیں مضمون ہے"۔[1]

اسی طرح خورشید الاسلام نے بھی رائے دی ہے کہ "یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ خطوں میں قل ہو اللہ کی تفسیر نہیں ہوتی، خط حسن اتفاق کا نام ہے..... اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں، اور ان کے لکھنے کے لئے ادبی فیل پا کے مرض میں مبتلا ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں، خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنتے جاتے ہیں..... وہ خطوط جن میں استدلال کا زور ہو، فلسفہ پر باقاعدہ بحثیں ہوں، بالارادہ فن کاری ہو، خطوط نہیں ہوتے، خطوں میں مرزا بیدل کے اشعار کی گنجائش ہے، لیکن ان کی ماورائیت پر مدلل بحث کی گنجائش نہیں، آپ خطوں میں رو سکتے ہیں، قہقہے لگا سکتے ہیں لیکن اخلاقاً مصلحتاً اور قانوناً نہ شوپنہار کی قنوطیت پر وعظ کہنے کی اجازت آپ کو دی جا سکتی ہے اور نہ قہقہوں پر مضمون لکھنے کا موقع آپ کو حاصل ہے"۔[2]

۱۔ تنقیدی اشارے۔ طبع چہارم۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ صفحہ ۶۳۔
۲۔ تنقیدیں۔ طبع اوّل۔ سرفراز قومی پریس۔ صفحہ ۱۰۷،۱۱۔

ان اصولوں پر جب ہم غبارِ خاطر کے مکاتیب کو جانچتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اُن معنوں میں خطوط نہیں ہیں جن میں ہم سوفٹ، چارلس لیمب، شبلی، مہدی اور اکبر کے خطوط کو سمجھتے ہیں، ان کی فضا میں نہ تو وہ پُرسکون انادگی ہے جو خطوط کی جان ہوتی ہے اور نہ یہ بے ارادہ لکھے گئے ہیں، یہ "حسن اتفاق" نہیں ہیں بلکہ مکتوب نگار نے واقعات اس لئے سُناتے ہیں کہ رشتہ سخن کی گرہیں کھُل جائیں اور اس کا مقصود اس تمام دراز نفسی سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطبت کے لئے "تقریب سخن ہاتھ آئے" ان میں اس صداقت اور خلوص کا فقدان ہے جو مکتوب نگار کو نادان بچّوں کی طرح نہ صرف اپنے اوپر اعتماد کے لئے آمادہ کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اعتماد کے لائق بناتا ہے یہ خطوط اس لئے نہیں لکھے گئے کہ قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کی محبت کا جذبہ مکتوب نگار کے دل میں اُبل پڑا تھا بلکہ مولانا کو چونکہ فرصت کے لمحات میں کچھ نہ کچھ کرنا تھا اس لئے "خامہ فرسائی" سے زیادہ معقول مشغلہ اور "خطوط نویسی" سے زیادہ آسان صنف، جس میں گریز کے سب سے زیادہ امکانات موجود ہیں، ان کو نہ مل سکا، وہ لکھتے ہیں،

> "یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، کلیترہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے یہ بھی نہیں معلوم، بحالت موجودہ میری صدائیں آپ تک پہونچ بھی سکیں گی یا نہیں، تاہم کیا کروں، افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوق خامہ فرسائی کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا۔ "مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا"[۲]

آپ "صدیق مکرم" کی جگہ میرا، اپنا یا مسٹر جناح کا نام لکھ لیجیے

۱۔ غبارِ خاطر۔ میری لائبریری مکتبہ جدید۔ صفحہ ۴۰ ۲۔ غبار خاطر۔ صفحہ ۸۷

نفسِ موضوع میں کوئی فرق نہیں پڑے گا صرف ایک خط کی چند سطروں میں جہاں مولانا نے نواب صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے، کسی بھی خط میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ان میں استدلال کا زور بھی ہے اور فلسفیانہ بحثیں بھی، اس میں صرف ایک باتیں کرنے والا اور ایک باتیں سننے والا ہی نہیں ہے بلکہ ایک محفل ہے، ایک غولِ بیابانی ہے، ساری دنیا بیدار معلوم ہوتی ہے اور اسی لئے ان پر خط کا اطلاق نہیں ہوتا مکتوب نگار کے شعور میں ہر وقت یہ خیال کارفرما رہتا ہے کہ وہ صرف مکتوب الیہ ہی سے مخاطب نہیں ہے بلکہ اور بھی لوگ ہیں جو اس کی باتوں کو سُن رہے ہیں اور اسے دیکھ رہے ہیں، وہ کہیں بھی تیر کو کمان سے نکلنے نہیں دیتا، اور اگر کبھی تیر غیرارادی طور پر اس کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے اور اس بات کے خطرات پیدا ہوتے ہیں کہ غلط نشانے پر جا لگے گا تو وہ اپنی ذہانت اور علم کے شہپر سے پرواز کرتا ہوا بیچ راستے سے اس کے رُخ کو موڑ دیتا ہے تاکہ پہلے کے طے کئے ہوئے نشانہ پر ترازو ہو جائے وہ نغمہ و موسیقی سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے، وہ اپنی شناسائی کا ذکر مصر کی مشہور عالمہ طاہرہ سے کرتا ہے "جو خود بھی بلائے جان تھی مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفت ہوش و ایمان تھی"۔ وہ بین اور ستار سے اپنی دلچسپی کا تذکرہ کرتا ہے، مگر یکایک اسے احساس ہوتا ہے کہ شاید یہ اعتراف اس کی پبلک لائف کے شایانِ شان نہیں ہے، اور پھر وہ فوراً یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ "اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ

---

[۱] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۷۵

میں داخل ہے حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہار نے سد وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ باب تشریع سے، قضا کا میدان نہایت وسیع ہے، ہر چیز جو سوئے استعمال سے کسی مفسد کا وسیلہ بن جائے، قضاءً روکی جا سکتی ہے لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا[1]" یہ اگر خود کلامی ہے تو نہایت ہی محتاط قسم کی، وہ اپنے مخاطب سے شب خوابی کے لباس میں اگر باتیں بھی کرتے ہیں تو ایک مخصوص حد تک نیاز فتح پوری نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

"مولانا کے خطوط جو اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں وہ زیادہ تر پند نامہ عطّار کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے ان کی خلوت پر روشنی نہیں پڑتی، یہاں تک کہ حکایت زاغ و بلبل اور چڑیا چڑے کی کہانی قسم کی ہلکی چیزوں میں بھی وہ اپنی فلسفیانہ سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور جب اپنے ذوق چائے نوشی کا ذکر کرتے ہیں تو گفتگو اس کے آئین و آداب تک پہونچ جاتی ہے، اسی طرح جب سلسلۂ بیان میں کسی خاص شخص یا مقام کا ذکر آجاتا ہے تو وہ تاریخ کے صفحے الٹ کر رکھ دیتے ہیں...... مولانا کی فطرت اس صدف کی سی فطرت تھی جو اندر ہی اندر قطرۂ نیساں کو موتی بنایا کرتی ہے اور کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا[2]"

یہ بات ضرور صحیح ہے کہ غبار خاطر سے مولانا کی داستان حیات مرتب کرنے

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۲۹۵ [2] ماحول آزاد نمبر۔ ستمبر ۱۹۶۰ء

میں بڑی مدد ملتی ہے اور مل سکتی ہے لیکن قاضی عبدالغفار کی یہ رائے قابل اعتنا نہیں کہ "غبارِ خاطر کے مکتوبات...... اس ارادے سے لکھے ہی نہیں گئے تھے کہ وہ کبھی شایع بھی ہوں گے۔ اس لئے ان کے اندر مولانا کے افکار کا بہاؤ ایک صحرائی چشمے کی طرح آزاد ہے، اس بہاؤ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں، اس چشمہ پر نہ تو کوئی پُل باندھا گیا ہے اور نہ اس کے پانی پر ملاحوں کی کشتیاں تیرتی ہیں، نہ اس کا پانی بستیوں اور شہروں کے خس و خاشاک سے آلودہ ہے، یہ چشمہ ایک خاموش وادی کی آغوش میں اپنی فطرت کے مطابق بہتا چلا گیا ہے[1]۔ "غبارِ خاطر میں مولانا نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے احتیاط کی چھلنی میں انھوں نے اچھی طرح چھان لیا ہے، اور ان کے افکار کا بہاؤ انھیں راستوں سے ہوتا ہوا گذرتا ہے جو متعین منزل مقصود کی طرف پہونچتا ہے، اس پر علمی نمائش کے عظیم الشان پُل بھی بندھے ہوئے ہیں، فلسفیانہ مباحث سے لدی ہوئی کشتیاں بھی تیرتی ہیں اور مولانا کی شعریت نے ایک چادر بن کر ان کے حقیقی تاثرات کے چہرے کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات پر تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نقطے پر شاعری ختم ہوئی اور حقیقت شروع ہوئی، غالبؔ نے اپنے مکاتیب میں فن کو زندگی پر فضیلت نہیں دی، ان کی زندگی ان کے فن کا وسیلہ بن گئی۔ اس کے برخلاف ابوالکلام اپنے فن سے اپنی زندگی کے خد و خال کو اجاگر کرتے ہیں اور یہی چیز بحیثیت خط کے غبارِ خاطر کا المیہ بن جاتی ہے، اس لئے کہ خطوط نگاری میں کمال حاصل کرنے کے لئے کسی فن کی ضرورت

---

[1] آثار ابوالکلام صفحہ ۱۴۱-۱۴۲۔

نہیں، نہ کوئی اصول، نہ کوئی خیال، نہ کوئی موضوع، نہ ابتدا، نہ انتہا، نہ وسط نہ تکمیل، نہ تنبیب نہ دعائیہ، خط صرف گریز کا نام ہے اور یہ گریز جب خونِ جگر کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے تو بقول خورشید الاسلام "بے اصولی بھی ایک اصول بن جاتی ہے، لغزشیں حسین ہو جاتی ہیں، چاند اور سورج خود بنتے سنورتے اور غروب ہو جاتے رہتے ہیں[1]" البتہ کسی قدر حقیقت یہ ہے کہ غبارِ خاطر میں مولانا نے جیل کی تنہائی میں سنہری یادوں کی ایک بزم سجائی ہے، یہاں مکتوب الیہ سے یوں ہی غرض ہے اور بقول آل احمد سرور "کاتب اپنے دل کے داغوں کی بہار دیکھنا چاہتا ہے، غبارِ خاطر خطوں کا مجموعہ نہیں، مضامین کا مجموعہ ہے اور مضمون نگاری کے لحاظ سے ان کا اسلوب بھی ہے[2]"

آل احمد سرور کی یہ رائے کہ یہ مضامین کا مجموعہ ہے بڑی حد تک صحیح ہے، ان مکاتیب میں کچھ ایسے ضرور ہیں جن پر مضمون کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے کہ مضمون کی زد میں "مذہبی، سیاسی، سماجی مضامین سے لے کر علمی، ادبی و تحقیقی ہر طرح کے مضامین آجاتے ہیں[3]" ان کے اندر مواد بھی ہے اور ان کی افادیت بھی مسلم ہے، کچھ خطوط میں سارا زور بات کو عالمانہ انداز سے کہنے اور معلومات فراہم کرنے پر صرف ہوا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کی باتیں غور و فکر کے دامن پہ آویزاں بھی کی گئی ہیں مگر اس کتاب کے زیادہ تر خطوط کے اندر وہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں جو اچھے انشائیہ کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان مکاتیب کے

---

[1] تنقیدیں۔ صفحہ ۹ [2] اردو ادب آزاد نمبر۔ صفحہ ۱۲
[3] ادب کا مطالعہ۔ صفحہ ۱۰۶۔

اندر مضمون نگاری کا شخصی انداز ملتا ہے، ہر ہر لفظ پر مصنف نے اپنی شخصیت کی مُہر لگا دی ہے، اس کے اکثر خطوط میں مولانا نے اپنے تجربے، اپنے انداز میں بیان کئے ہیں اور یہ تجربے ان کے داخلی احساسات کا ایک جزو بن گئے ہیں جہاں حقیقتیں محض خارجی یا بیرونی دنیا سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ ان سے دلوں کی بستیاں بھی آباد ہوتی ہیں، یہاں مولانا کا واقعات سے زیادہ واقعات کے ردعمل سے تعلق ہے۔ انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی، یہ جے، بی مورٹن کے الفاظ میں نثر کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے یہاں ادب کے میکانکی عمل سے ہٹ کر زندگی کا مطالعہ نظر آتا ہے، اور اس کام میں لکھنے والے کی اپنی داخلی کیفیت رہنما بن جاتی ہے، اس نے زندگی کو جس طرح برتا اور جس رنگ میں دیکھا ہے اسے وہ تمام تر داخلی کیفیات کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ یہ ڈاکٹر جانسن کے الفاظ میں انسانی دماغ کی ڈھیلی ڈھالی بے پروا قسم کی اُڑان کا نام ہے، یوں تو یہ انداز خطوط نگاری میں بھی عام ہے، لیکن خطوط نگاری میں پھر بھی ایک دوسری شخصیت سامنے ہوتی ہے جو اسے اپنا مخاطب بناتی رہتی ہے اور جس کے وجود کا خط لکھنے والے کو ہر لمحہ احساس رہتا ہے اور یہ بات پہلے ہی کہی جا چکی ہے کہ ان خطوط میں مکتوب الیہ سے مولانا کا تعلق یوں ہی سا ہے، اس بزم میں صرف مولانا ہی مولانا ہیں، وہ خود اپنی ذات سے انجمن ہیں، یہاں مولانا نے لغزشوں کو بھی حسین بنایا ہے، ان کو وہ فراغت میسّر ہے جو انشائیہ کے لئے درکار ہوتی ہے، جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کی فراغت" چونکہ انشائیہ اپنے مصنف کی شخصیت کی غمازی کرتا ہے، اور اس کی

شخصیت ماحول کی پروردہ ہے، اس لئے یہاں ماحول بھی نظر آتا ہے، ہر انشائیہ اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور یہ عہد اس انشائیہ میں ہر لمحہ جھانکتا رہتا ہے۔ "غبارِ خاطر" میں مصنف کی شخصیت، اس کے تجربات اور ماحول سبھی کی جھلک ملتی ہے، اور اسی لئے ان بنیادی لوازمات کے پیشِ نظر ہم غبارِ خاطر کو خطوط سے زیادہ انشائیہ کے قریب پاتے ہیں، مگر میرے خیال میں انشائیہ اور مضمون کے درمیان اس فرق کے بارے میں اس قدر سخت احتساب کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فنی تخلیقات کے لئے جو خانے بنائے گئے ہیں وہ محض ذاتی سہولتوں کے پیشِ نظر ہیں۔ انگریزی انشائیہ نگاروں کی تخلیقات میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے اور یہی حال اردو انشائیہ نگاروں کا بھی ہے، اصل میں انگریزی انشائیہ سے جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے اس کی زیادہ جھلک غبارِ خاطر میں ملتی ہے۔

مولانا کی افتادِ طبع اور انفرادیت

غبارِ خاطر کے بیشتر خطوط میں مولانا نے اپنی تعلیم و تربیت، نشو و نما، افکار و خیالات، تاثرات و میلانات، خاندانی حالات اور قید و بند کی کیفیات اور معمولات و مشاغل کا ذکر کیا ہے، ایک خط میں اہلیہ کی علالت اور وفات کا ذکر ہے دو خطوط میں خدا کی ہستی اور کائنات پر فلسفیانہ زاویۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے، ایک خط میں فرانسیسی مصنف "تمد، این، دیل" تصنیف (MEMOIRS OF THECRUSADES) کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے، ایک خط میں ایرانی ادبیات کا جائزہ ہے اور آخری خط کے بیشتر حصے میں فنِ موسیقی

لے اردو ادب کا مطالعہ۔ اطہر پرویز۔ اردو گھر۔ علی گڑھ۔ بار دوم ستمبر ۱۹۶۲ء۔ صفحہ ۱۱

پر خامہ فرسائی ہوئی ہے

غبار خاطر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے مصنف کے ذہنی و نفسی ارتقاء کے نقطۂ انتہائی کا حال کسی حد تک معلوم ہوتا ہے اور اس کے اندر اس گنبد کا چور دروازہ کسی حد تک دکھائی دیتا ہے، جس میں اس نے اپنے وجود معنوی کو بند رکھا تھا، "کسی حد تک" کا فقرہ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کھل کر اور بے تکلف ہو کر وہ کبھی بھی ہمارے سامنے نہیں آئے، لیکن غبار خاطر ایک ایسی کتاب ہے جس کی سطور کو پڑھ کر اور بین السطور کو سمجھ کر مولانا کے مزاج، معمولات، خاندانی و اکتسابی عوامل، اوراق و افکار، اور واردات قلب کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے، مگر یہ مطالعہ بہت ہی احتیاط سے کرنا ہوگا، ورنہ ان کا انداز تحریر قدم قدم پر دھوکا دے سکتا ہے، اس لئے کہ مولانا بہرحال ان ادیبوں میں سے نہ تھے جو اپنی انانیت کو بغیر کسی نمائشی وضع میں بجائے دوسروں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جس کی انفرادیت ہر دیگ میں ایک ہی طرح نہیں اُبلتی، وہ کبھی دھیمے سُروں میں بولتی ہے اور کبھی اس قدر پُرجوش ہوتی ہے کہ اس کی آواز سے سارا اگرد و پیش گونج اُٹھتا ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود مولانا لکھتے ہیں:

"ہماری درماندگیوں کا عجب حال ہے، ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچا لے جا سکتے ہیں، مگر خود اپنے آپ سے بچا نہیں سکتے، ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں، لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی،"

ہم جہاں جاتے ہیں، ہمارا سایہ ساتھ جاتا ہے"[1]

۹ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء کا وہ مکتوب جس میں مولانا نے انانیتی ادب کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے اس سے مولانا کے فن کی بنیادی قدروں کی نشاندہی ہوتی ہے، ان لوگوں کے بارے میں جن کی "انا" کافی پرجوش ہوتی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

"ایسے افراد اپنی "میں" کا سرجوش کسی طرح نہیں دبا سکتے، ان کی خاموشی بھی چیخنے والی اور ان کا سکون بھی تڑپنے والا ہوتا ہے، ان کی انفرادیت دبانے سے اور زیادہ اچھلنے لگے گی ایسے افراد جب کبھی "میں" بولتے ہیں تو اس میں قصد، بناوٹ، نمائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ سرتاسر حقیقت حال کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہوتی ہے ...... ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیار نظر سے الگ رکھنا پڑے گا، ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازو میں نہیں تولے جا سکتے، ادب و تصنیف کے عام قوانین انھیں اپنے کلیوں میں نہیں پکڑ سکتے، زمانے کو ان کا یہ حق تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ چاہیں "میں" بولتے رہیں، ان کی ہر "میں" ان کی ہر "وہ" اور "تم" سے کہیں زیادہ دلنشیں ہوتی ہے"[2]

اس اقتباس کی روشنی میں اگر ہم غبار خاطر کا مطالعہ کریں تو مولانا کے اسلوب نگارش اور طرز تفکر کی بہت سی گرہیں کھل جائیں گی غالب کی طرح

۱؎ غبار خاطر۔ صفحہ ۱۹۷ ۲؎ غبار خاطر۔ صفحہ ۲۰۳ - ۲۰۲ -

مولانا کی انفرادیت یا ان کی انانیت شاہراہِ عام پر چلنا گوارا نہیں کرتی تھی، وہ خود لکھتے ہیں :

"بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے اور چونکہ مانگ ہوتی ہے اس لئے ہر ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اُسے قبول کرتی ہے، مگر میرا معاملہ اس سے بالکل اُلٹا رہا جس جنس کی عام مانگ ہوئی میری دُکان میں جگہ نہ پا سکی، لوگ زمانے کے روز بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈھ کر لائیں گے جن کا عام رواج ہو، میں نے ہمیشہ ایسی چیزیں ڈھونڈ کر جمع کیں جس کا کہیں رواج نہ ہو، اوروں کے لئے پسند اور انتخاب کی جو علت ہوئی، وہی میرے لئے ترک و اعراض کی علت بن گئی۔ انھوں نے دوکانوں میں ایسا سامان سجایا جس کے لئے سب ہاتھ بڑھیں، میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں جس کے لئے سب کے ہاتھ بڑھیں ؎

قماش دست زد شہر وہ زمن مطلب
متاع من ہمہ دریائی ست یا کائی

لوگ بازار میں دوکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگی ہو، میں نے جس دن اپنی دوکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے ؎

در کوئے ما شکستہ دلی می خرند و بس
بازار خود فروشی ازاں سوئے دیگر است

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا، کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

بارفیقاں زخود رفتہ سفر دست نہ داد
سیر صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم

جس راہ میں بھی قدم اُٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑکے دیکھتا تو گرد راہ کے سوا کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا، اور یہ گرد بھی اپنی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔"[1]

مولانا کی یہی کم آمیزی جسے آپ خودداری، انفرادیت، انانیت یا احساس برتری کے نام سے پکار سکتے ہیں، ان کی عقلیت اور عبقریت کا ایک امتیازی نشان ہے، وہ ہر معمولی واقعہ میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی امتیاز کا پہلو نکال لیتے ہیں، اور اپنے قلم اور زبان سے کسی ایسی عمومیت کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے جو قاضی عبدالغفار کے الفاظ میں "سرفراز عقلیت" کے سانچے میں نہ ڈھل سکے، عالم خوندمیری کی یہ رائے کہ "ان کا ایغو یا انا کسی ایک برتر شخصیت کے کامل اتباع کا روادار نہیں ہوسکتا تھا اور وہ خود کوئی نیا راستہ تراشیں ان کے لئے شاید ممکن نہیں تھا"[2] صحیح نہیں ہے، سیاست کے میدان میں انھیں مجتہد کا اعلیٰ مقام حاصل ہوا یا نہیں یہ میرے موضوع سے خارج ہے لیکن صحافت اور ادب کے میدان میں ان کی یہی انا، ان کی انفرادیت اور دائمی زندگی کی ضامن بن گئی۔ آپ ان کے نظریہ حیات، فلسفیانہ اور جمالیاتی افکار سے اختلاف کر سکتے ہیں

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۱۶ [2] عالم خوندمیری۔ صبا آزاد نمبر۔ صفحہ ۱۰۲۔

تاہم ان کی انانیتی ادب کی دلپذیری سے انکار کرنا مشکل ہوجائے گا' ان کے فلسفۂ زیست کی سب سے بڑی حقیقت ان کی "انا" تھی اور بقول عابد رضا بیدار "وہ اس عہد کا سب سے بڑا "ایگو" تھے" یہ خیال غلط ہے کہ بلند تر "انا" اور نسبتاً کم بلند ارادہ کی کشمکش مولانا کی زندگی کے حزنیہ کا بنیادی سبب ہے' عشق کی طرح "ایگو" کے بھی اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہوتے ہیں' یہ فرد کو سیہ کار بھی بنا سکتا ہے اور باصفا بھی' یہ اپنے آپ کو منوانے کے لئے عمیق ترین پستیوں تک بھی پہونچ سکتا ہے' اور اعلیٰ ترین بلندیوں کو بھی چھو آتا ہے' مولانا کا "ایگو" لطافتوں میں نہاتا ہوا رنگ ونور کے پردوں سے چھن چھن کر ایسی نکھری ہوئی شکل میں نمودار ہوا ہے کہ اس نے زندگی اور سماج کو نکھار کے اپنی اہمیت کو منوا لیا ہے' وہ اپنے آپ کو کبھی نہیں بھولتے اور یہ کبھی نہ بھولنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ دوسرا بھی ان کو نہیں بھول سکتا' عابد رضا بیدار نے صحیح کہا ہے کہ اردو کے کسی مصنف نے اپنے بارے میں اتنا نہ لکھا ہوگا جتنا مولانا لکھ گئے اور دنیا کے کم ادیبوں نے صرف اپنے بارے میں لکھ کر شہرت اور مقبولیت کی ایسی معراج حاصل کی ہوگی جیسی مولانا نے[1] "انھوں نے اپنے طور پر زندگی کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا' اور اس زندگی کا سارا محور وہ خود تھے' انھوں نے زندگی کے آئینے میں اپنا عکس دیکھنے کی سعی لاحاصل کبھی نہیں کی۔ غبار خاطر مولانا کی انفرادیت اور انانیت کی مثالوں سے بھری پڑی ہے' وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنی ذہانت سے اپنی انفرادیت کو سمو دیتے ہیں اور انداز نگارش میں امتیاز کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں' وہ کسی عمومیت سے مفاہمت

---

[1] صبا آزاد نمبر۔ صفحہ ۳۸ [2] غبار خاطر۔ صفحہ ۷۲۔

نہیں پیدا کر سکتے، اس لئے کہ ان کا مسلک تقلید نہیں اجتہاد ہے، وہ سونے جاگنے، کھانے پینے کے معاملات میں بھی منفرد ہیں، اپنے سونے اور جاگنے کے اوقات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"سوچتا ہوں زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی ساری دنیا سے اُلٹی چال میرے حصہ میں آئی، دنیا کے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا وہی میرے لئے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی، لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں، میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت اندوز ہوتا رہوں ؎

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من
ایں عجب کاں دم کہ می گویم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا، میں نے دنیا کو ایسی جراتوں کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا وہ جب جاگتی ہے میں سو رہتا ہوں، جب سو جاتی ہے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں۔"[1]

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر قید خانہ کی پابندیوں کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے اندر اپنی انفرادیت اور انا کو کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"قید خانہ سے باہر کی دنیا کے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا، کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک بھی پہونچ سکیں گے یا نہیں تاہم ذوق مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح دل مستمند

---

[1] غبار خاطر - صفحہ ۷۲ -

پرچھا گئی تھیں کہ قلم اُٹھا لیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا
تھا، لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا کبھی بالی کبوتر سے
میرے حصہ میں عنقا آیا ہے
اس رسم و راہ تازہ زحرمان عہد ماست عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود[1]

اس سیدھی سادی اور معمولی بات میں مولانا نے اندازِ تحریر کا جو امتیازی پہلو پیدا کر لیا ہے وہ بقول قاضی عبدالغفار "کوئی سخن گسترانہ بات نہیں بلکہ حقیقتاً مولانا کے افکار کی اس انانیت اور انفرادیت کا ایک عکس ہے جو ہر بات پر اُنگلی اُٹھا کر کہتی ہے اس بات کو یوں نہ کہو جیسے عوام کہتے ہیں[2]" یہی نہیں بلکہ ناسازگار اور خطرناک مواقع پر بھی مولانا نے اپنی خودداری، پندار اور اپنے غیور مزاج کی آن کو محفوظ رکھا ہے، جیل خانہ کے ایک واقعہ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"انسپکٹر جنرل نے کہا اگر آپ کتابیں یا اور کوئی سامان گھر سے منگوانا چاہیں تو ان کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں، گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دے گی، چونکہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لئے میرے پاس دو کتابوں کے سوا جو راہ میں دیکھنے کے لئے ساتھ رکھ لی تھیں، مطالعہ کا کوئی سامان نہ تھا، خیال ہوا اگر مکان سے بعض مسودات اور کتابیں آجائیں تو قید و بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے، بظاہر اس خواہش میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی .... میں نے مطلوبہ اشیا کا ایک پرچہ لکھ کر اس کے حوالہ کیا اور وہ لے کر چلا گیا لیکن اس کے جانے کے بعد جب صورتِ حال پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا تو طبیعت میں ایک خلش سی

---

[1] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۳۱ [2] آثار ابوالکلام۔ صفحہ ۱۲۷۔

محسوس ہونے لگی، معلوم ہوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی کہ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اُٹھانے پر راضی ہو گئی، جب عزیز و اقربا سے ملنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کر دے گی، ایسی حالت میں عزتِ نفس کا تقاضا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے اور نہ کوئی توقع رکھی جائے ؎

نہ تیغِ بے نیازی نا توانی قطعِ ہستی کن
فلک تا افگند از پا ترا خود پیش دستی کن

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا کہ فہرست کا پرچہ واپس کر دیا جائے جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرزِ عمل قائم رہتا ہے میں کوئی چیز مکان سے منگوانا نہیں چاہتا۔[1]

"عزتِ نفس" کے آبگینہ کو مولانا نے ہر طرح سے بچائے رکھا، وہ اپنی اہلیہ کی موت کی خبر جس انداز میں سُنتے ہیں اور انفرادیت کے جس غرور کے ساتھ وہ زہرِ غم کے اس پیالے کو مسکراتی ہوئی ظاہرداریوں کے ساتھ پی جاتے ہیں، وہ ان کی زندگی کی مخصوص افتادِ طبع تھی جس کی حقیقت کو ہم غبارِ خاطر کے صفحات پر سمجھتے ہیں، ان کے مغرور تحمّل کا یہ منظر ملاحظہ فرمایئے :

"جیلر اخبار لے کر سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے جوں ہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ ہوتی ہے دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی، لیکن پھر میں فوراً چونک اُٹھتا، میرے صوفے کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کر سامنے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا، جب جیلر آتا تھا تو میں حسبِ معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا تھا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا گویا اخبار دیکھنے کی

---

[1] غبارِ خاطر ۔ صفحہ ۷۷ ۔ ۷۸ ۔

کوئی جلدی نہیں، میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ساری ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا ایک مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔ ...... بالآخر ۹ راپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔[1]

اس تمام سوز و گداز میں نہ صرف مولانا کے دماغ کا مغرور احساس بالکل عریاں ہے بلکہ مولانا کی واردات قلب اور نفسیات کے مختلف پہلوؤں کا خمیر اسی خطِ غبار میں منعکس نظر آتا ہے، اور اس کے صفحات پر مولانا کی فطرت کی زندہ تصویریں متحرک نظر آتی ہیں، ان کی کم آمیزی، مشکل پسندی، انانیت، انفرادیت، غمگینی، طنز و مزاح، مطالعۂ کائنات اور مشاہدۂ فطرت، مذہب اور فلسفیانہ نکتہ سنجی سبھی چیزوں پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے، انھوں نے بار بار پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ اپنی کم آمیز فطرت، اور خلوت پسندی کو غبار خاطر کے صفحات میں عریاں کیا ہے اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا، یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے، اس لئے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑا، مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈھتی رہتی ہے، جوں ہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی وہ اپنی کام جوئیوں میں لگ گئی۔"[2]

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۰۴۔ [2] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۰۴۔

مولانا کی یہ افتادِ طبع عوامی زندگی کے اس اتصال سے متضاد ہے جو سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت ان کو قائم رکھنا پڑتا تھا، لیکن اس کے باوجود یہی اندازِ مزاج دوسری حیثیتوں سے ان کے لئے مفید ثابت ہوا، اور ایک استغنا کی حالت میں منتقل ہو گیا۔

"طبیعت کی افتاد نے بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لئے بے کار ہو گئے، لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور زیادہ منت گذار ہونے لگتا ہے، کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوشحال کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔"[1]

مولانا کی یہ خلوت پسندی اور طاقت ور انا جو رومانیت کی پروردہ ہے، جب زمانے کے سخت نظام اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ٹکراتی ہے تو قدم قدم پر ان کے جذب و شوق کے بلبلے ٹوٹتے ہیں، اور ایک غیر معمولی اداسی اور کرب کو سینہ سے لگا کر وہ ایک دور افتادہ صدا، اور وطن میں غریب الوطن بن جاتے ہیں، وہ عوامی زندگی سے کتنے ہی بیزار کیوں نہ ہوں لیکن یہ ناخوشگوار فرض انھیں ادا ہی کرنا پڑتا ہے، ان کے جذبات اور حقائق کے درمیان جنگ ہوتی ہے اور اس جنگ کے زخموں کو وہ پھول سمجھ کر چنتے ہیں اور اسی میں زندگی کا کیف اور حسن محسوس کرتے، غبارِ خاطر کے صفحات پر اس رومانوی کرب اور خود گدازی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، ان کے میکدۂ خلوت میں عیش و طرب کی سرمستیاں ضرور رہیں، مگر اس کی وجہ محض ان کی رومانیت ہے جو اپنی شکستوں کے باوجود اپنے خوابستان کو نہیں چھوڑتی اور اپنی شکست کو

---

[1] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۱۰۷۔

"شکستِ فاتحانہ" بنالیتی ہے، وہ دکھ درد کو پھولوں میں تبدیل کر کے اسی کو اپنا مزاج قرار دے لیتے ہیں، اور ان کی تحریروں میں سوز و گداز کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے، ایک مقام پر لکھتے ہیں :

"جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصہ میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے انھوں نے پھول چن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے، ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے[1]"

اسی طرح ۱۴ر جون ۱۹۴۲ء کے مکتوب میں ایک شاخِ بریدہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"یہاں احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے، کچھ دن ہوئے ایک وارڈر نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی، اب بارش ہوئی تو تمام میدان سر سبز ہونے لگا، نیم کی شاخوں نے زرد چیتھڑے اتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا جس ٹہنی کو دیکھو ہرے ہرے پتے اور سفید سفید پھولوں سے لد رہی ہے لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو گویا اس کے لئے کوئی انقلاب حال ہوا ہی نہیں ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے ...... یہ بھی اسی درخت کی ایک شاخ ہے جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا، یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں

---

[1] غبارِ خاطر - صفحہ ۷۰ -

سے کوئی سروکار نہ رہا، بہار و خزاں، گرمی و سردی، خشکی و طراوت
سب اس کے لئے یکساں ہوگئے، کل دوپہر کو اس کی طرف سے
گذر رہا تھا، یکایک اس شاخِ بریدہ سے پاؤں ٹکرا گیا، میں
رک گیا اور اسے دیکھنے لگا، بے اختیار شاعر کی حسن
تعلیل یاد آگئی ؎

قطع امید کردہ نہ خواہد نعیم دہر
شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست[1]

مولانا کی طبیعت کا یہ سوز و گداز جو ان کی فطری شعریت کا پروردہ تھا
کہیں ہلکے اور کہیں بھاری پردے میں چھپ کر اپنا جلوہ دکھاتا ہے، لیکن
ان کی طبیعت کی خودداری اور مزاج کا ضبط ان کے اظہار میں مانع ہوتا ہے
اس لئے کہ ان کا شخصی وقار "اظہارِ غم" کو کمزوری کے مترادف سمجھتا ہے اور
ہ اپنی افسردگی اور دل گرفتگی کو اپنی تمکنت اور وقار سے دباتے رہتے
یں، انتہائی کرب و اذیت کی حالت میں بھی وہ خودداری اور وقار کے
امن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے، ان کی زندگی کا ایک المناک واقعہ
ن کی اہلیہ کی وفات ہے، انھوں نے اس واقعہ کا بھی ذکر جس انداز میں
یا ہے اور قلم کو یارائے ضبط کا جو طریقہ سکھایا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے
ن کے اس خط سے غمگین یادوں کے سائے ضرور ابھرتے ہیں مگر جس
بے دبے اور سہمے سہمے انداز میں وہ ان یادوں کا اظہار کرتے ہیں ان سے
اف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ضبط و تحمل کے ضابطے کی خلاف ورزی بھی نہیں
رنا چاہتے اور ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کا غم رسوا نہ ہوجائے، جیل کے اندر

---

[1] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۵۲ - ۲۵۳ -

جوں ہی اپنی اہلیہ کی علالت کی خطرناک صورت حال کا علم ان کو ہوتا ہے وہ اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کرتے ہیں اور ضبط و انقیاد میں لانے کے باوجود وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے دل کا سکون ہل گیا ہے، اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے انھیں جد و جہد کرنی پڑے گی، وہ لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں، اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن باطن نہ ہو سکا، میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے، سب سے پہلی یہ کوشش کرنی پڑی کہ یہاں کی زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق نہ آنے پائے"...... میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا، ٹھیک وقت پر کمرے سے نکلتا رہا، اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا، بھوک یک قلم بند ہو چکی تھی لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا، رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی، اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا، جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، جس طرح کی باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا، اخبارات یہاں بارہ بجے سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں...... جیلر اخبار لے کر سیدھا میرے کمرے

میں آتا ہے جوں ہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی، لیکن پھر فوراً چونک اُٹھتا .... جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا ، گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں، میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و قرار پہ بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے ۔[1]

بدہ یادب دے، کیں صورتِ بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹ اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا ہے

مولانا برسرِ عام ان تلخیوں کا اعتراف کرنا پسند نہیں کرتے جو ان کی مسکراہٹوں کے پیچھے چھپی رہتی ہیں، ان کی یہ تشدّد پسند خودداری جو بقول قاضی عبد الغفّار بجائے خود ایک نفسیاتی آمریت ہے ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں کرتی، کہ کمتر انسانوں کی نظر میں اس کا وزن ایک ذرہ بھی کم ہو جائے"[2] اور اسی لئے اس سوز و گداز کو چھپانے کی خاطر اور اس میں توازن و اعتدال پیدا کرنے کے لئے اپنے اس طریقۂ زندگی کی تاویل مختلف طریقوں پر کرتے رہتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"غور کیجئے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہے، یا

لے غبار خاطر۔ صفحہ ۲۵۴ - ۲۵۳ ؎۲ آثار ابوالکلام صفحہ ۲۰۳ -

یوں کہیے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہے......
میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں، اینٹوں کا پژاوہ بھر جاتا ہے،
درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں اور جہاز بن کر تیار ہو جاتے ہیں
سونے کی کانیں خالی ہو گئیں لیکن ملک کا خزانہ دیکھیے تو اشرفیوں
سے بھرپور ہو رہا ہے مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پاؤں تک بہا دیا
مگر سرمایہ دار کے راحت و عیش کا سروسامان درست ہو گیا، ہم مالی
کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ
کسی کے باغ کی کیاری اُجڑی ہو گی تب ہی جھولی معمور ہوئی ہے[1]"

سود و زیاں کا یہ فلسفہ سوز و گداز کی بے اختیاریوں کا پردہ بھی ہے اور ان طبیعتوں کا تسکین بخش علاج بھی جن کی خودداری اس بات کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جذبات سے متاثر ہوئے۔

مولانا کی یہی "انا" زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح مذہبی معاملات میں بھی رسم و رہِ عام سے بچا کر انھیں اپنا ایک الگ راستہ متعین کرنے پر مجبور کرتی ہے، وہ خاندانی عقائد کی کورانہ تقلید، اور تجدد پرستوں کی سطحی عقلیت دونوں سے الگ ہٹ کر اپنی ایک نئی راہ نکالتے ہیں اور اس کا ذکر غبار خاطر کے صفحات میں بار بار کرتے ہیں، وہ تقلید کی عام گرفت اور موروثی عقائد سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"معلوم ہوا کہ اختلاف و نزاع کی ان ہی متعارض راہوں میں
اور خیالات و اوہام کی ان ہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۲۵۸۔

اور قطعی راہ بھی موجود ہے جو یقین اور اعتقاد کی منزلِ مقصود تک
چلی گئی ہے...... جب تک موروثی عقاید کے جمود اور تقلیدی
ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں،
ہم اس راہ کا سراغ نہیں پا سکتے، لیکن جوں ہی پٹیاں کھلنے
لگتی ہیں، صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دور تھی اور نہ
کھوئی ہوئی تھی، یہ خود ہماری چشم بندی تھی جس نے عین روشنی
میں گم کر دیا تھا[۱]۔"

قدامت پرست اور کم استعداد اہلِ مذہب کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کے
علاوہ مولانا نے توہمات، مذہب کی ظاہری رسم و راہ، اختلافی و نزاعی عقاید
اور ریاکارانہ تقدس پر طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں ضرب شدید لگائی ہے۔
ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اب مختصراً ملّا اور صوفی کا بھی حال سن لیجیے، ایک چڑا بڑا ہی
تنومند اور جھگڑالو ہے، جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے
سر اُٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے جو بھی سامنے آجائے، دو
دو ہاتھ کیے بغیر نہ رہے گا، کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ
کے اندر قدم رکھ سکے، کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی لیکن
پہلے ہی مقابلے میں چیت ہو گئے، جب کبھی فرش پر
یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے، یہ سر و سینہ کو جنبش دیتا
ہوا اور اپنے داہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً آموجود ہوتا ہے
اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے، پھر اپنے

---

[۱] غبار خاطر۔ صفحہ ۶۱۔

شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں چوں شروع کر دیتا ہے، ٹھیک ٹھیک قانی کے واعظک جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے،....... فرمایئے اگر اس کا نام ملّا نہ رکھتا تو کیا رکھتا ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے، تعرف الاشیاء باضدادہا، اسے جب دیکھیئے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے۔

کاراں کہ خبر شد خبرش باز نیامد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا سا نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو، اور کبھی کبھی سر اُٹھا کر "ہا" کر دیتا ہو۔ میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا۔"

مولانا کی ارباب مذہب کے متعلق یہ معنی خیز تنقیح اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ عام مذہبی ظاہرداریوں کو قابلِ تحقیر ہی نہیں بلکہ ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں اور اسی لئے غبارِ خاطر میں ان کا ذکر مزاح و تفنّن کے انداز میں کرتے ہیں۔

طنز و مزاح غبارِ خاطر کے اسلوب نگارش میں طنز و مزاح کے تیر و نشتر سے بھی مولانا نے جا بجا کام لئے ہیں۔ ظرافت صرف ہنسنے ہنسانے کا ہی نام نہیں بلکہ اس کے اندر اخلاقی نکتہ چینی بھی ہوتی ہے، طنز و مضحکہ بھی، اس کے اندر چٹکیاں بھی ہیں، اور گدگدیاں بھی یہ کہیں معمولی بات کو بڑھا چڑھا کر رقیع بناتی ہے اور کہیں اونچی چیز کو پست کر دیتی

لہ غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۴۲-۲۴۱۔

ہے یہ ایک ایسا حربہ ہے جو دشمن کے خلاف مہلک ثابت ہو سکتا ہے اور دوست کی ہمدردی میں صفیں بھی تیار کر سکتا ہے، اس کا اثر، اس کے صحیح استعمال پر منحصر ہے، یہ ایک وجدانی چیز ہے، ابوالکلام کے طنز کے اندر آمد ہے، اور جب ان کی ظرافت زندگی کے مضحک پہلوؤں کے قریب آتی ہے، تو علم و فضل کی تمام تر سنجیدگی بھی اس کا راستہ نہیں روک پاتی، وہ مضحک پہلو کو اپنی ذہانت کی بنا پر بہت جلدی دیکھ لیتے ہیں اور طنز کا ایسا تیز اور بھرپور وار کرتے ہیں کہ کہیں سے بھی آور دکا پتہ نہیں چلتا، فرد، سماج اور فطرت ادب کے یہی موضوع رہیں اور بقول احتشام حسین "طنز نگار بھی مختلف شکلوں میں انھیں کو اپنا موضوع بناتا ہے"[1] انفرادی کمزوریوں یا شہ زوریوں کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں، ان کا انوکھا پن قابلِ تحسین بھی بن سکتا ہے، اور قابلِ ملامت بھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ بحث الگ ہے کہ کس کا راستہ صحیح ہے اور کس کا غلط، لیکن معتدل اور نارمل معیار سے ادھر یا اُدھر ہونے والے طنز کے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں، طنز نگار اس عدم اعتدال پر نگاہ رکھتا ہے اور حملہ ان نقائص اور زیادتیوں پر کرتا ہے جنھیں دور کرنے پر انسان قادر ہے اور اسی لئے سماجی یا اخلاقی پشت پناہی کے بغیر طنز کا وار ٹھیک نشانے پر نہیں بیٹھتا، چنانچہ جب مولانا اپنے قید خانہ کے ساتھی ڈاکٹر سید محمود کو ہر صبح پرندوں کو بلاکر روٹی کھلانے کے مشغلہ کو اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو طنز و مزاح کا حربہ استعمال کرتے ہیں، ان کے بارے میں

---

[1] تنقید اور علمی تنقید۔ طبع دوم۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ صفحہ ۴۱۔

لکھتے ہیں:

"روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے ہیں اور صحن میں جا کھڑے ہوتے ہیں، پھر جہاں تک حلق کام دیتا ہے آ آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے، یہ صلائے عام میناؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی، البتہ شہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا ہیں نے کوؤں کو شہرستان ہوا کا دریوزہ گر اس لئے کہا کہ کبھی انھیں مہمانوں کی طرح جاتے دیکھا نہیں، طفیلیوں کے غول میں بہت کم دکھائی پڑے، ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہونچے، صدائیں لگائیں اور چل دئے ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے

بہرحال محمود صاحب آآ کے تسلسل سے تھک کر جوں ہی مڑتے یہ دریوزہ گراں کوتہ آستیں فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے ...... صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے، اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں انھوں نے جو دیکھا کہ ؎

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

تو فوراً لبیک لبیک اور مرحمت عالی زیادہ کہتے ہوئے اس دسترخوان کرم پر ٹوٹ پڑیں ...... کوؤں کی دراز دستیوں سے جو کچھ بچتا ان کوتاہ دستوں کی کاوجویوں کا کھاجا بن جاتا ...... محمود صاحب کی صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کوؤں کی کائیں کائیں کی رونق چوکی

بجتی رہتی تھی، اب جو دسترخوانِ کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑ گئی
ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا، آخر ان سے کہنا پڑا کہ
اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رک نہیں سکتیں تو کم از کم چند
دنوں کے لئے ملتوی ہی کر دیجئے ورنہ ان ترکانِ یغما دوست
کی ترک تازیاں کمروں کے اندر گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے
بیٹھنے نہ دیں گی، اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوؤں کو خبر
ملی ہے اگر فیض عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب
نہیں کہ تمام دکن کے کوے قلعۂ احمد نگر پر حملہ بول دیں[لے]"

غبارِ خاطر میں جگہ جگہ مولانا نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں ان بد ذاتوں
کو بھی طعن و طنز کی نوک سے کریدا ہے جو کسی مخصوص معاملہ میں ان کی خوش ذوقی
معیار پر پورے نہیں اُترتے، لیکن ایسی جگہوں پر تعصب اور بغض و عناد
سے ہمیشہ ان کا دل پاک رہتا ہے۔ اور ان کے طنز میں فراخ دلی، وسیع القلبی اور
انسانی ہمدردی کے وہ تمام عناصر نظر آتے ہیں جو طنز کو اعلیٰ ادب بنانے
میں سازگار ثابت ہوتے ہیں، بقول احتشام حسین "دشمن سے دشمنی کا اظہار
اور پڑھنے والوں کی ہمدردی حاصل کرنا، زہر میں بجھے ہوئے جملے لکھنا اور پڑھنے
والوں کو اپنے ساتھ رکھنا آسان نہیں، لیکن طنز نگار کے انداز بیان کا جادو یہ
ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف اس سے متاثر ہوتا ہے بلکہ اپنے گریبان میں منھ
ڈال کر خود اپنی شخصیت کا جائزہ لینے لگتا ہے، جس جگہ یہ احساس ہو جائے کہ
طنز کسی ذاتی کینے اور بغض کا نتیجہ ہے اس جگہ دوسروں کی ہمدردیاں ساتھ
نہیں ہو سکتیں...... حالات کو بہتر بنانے کی خواہش، انسان دوستی کا جذبہ اور

[لے] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۹-۲۸-

ذاتی غصہ کو پی جانے کی طاقت کے بغیر کوئی اچھا طنز نگار نہیں بن سکتا[1]۔" چنانچہ ایک رفیق جیل کے ذوق سماع کی دقت امتیاز کا تذکرہ ۲/ مارچ ۱۹۴۳ء کے مکتوب میں یوں کرتے ہیں:

"دوسرے دن صبح برآمدے میں بیٹھا تھا کہ بلبل کے ترانے کی آواز پھر اٹھی، میں نے ایک صاحب کو توجہ دلائی کہ سُنا، بلبل کی آواز آ رہی ہے، ایک دوسرے صاحب جو صحن میں ٹہل رہے تھے کچھ دیر کے لئے رُک گئے، اور کان لگا کر سُنتے رہے، پھر بولے کہ ہاں قلعہ میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے، اس کے پہیوں کی آواز آ رہی ہے، سبحان اللہ، ذوق سماعت کی دقت امتیاز دیکھیے، بلبل کی نواؤں اور چھکڑے کے پہیّے کی ریں ریں میں یہاں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا،...... خدارا انصاف کیجیے، اگر دو ایسے کان ایک قفس میں بند کر دیے جائیں کہ ایک میں تو بلبل کی نوائیں بسی ہوں، دوسرے میں چھکڑے کے پہیّوں کی ریں ریں تو آپ اسے کیا کہیں گے،...... اصل یہ ہے کہ ہر ملک کی فضا طبیعتوں میں ایک خاص طرح کا طبعی ذوق پیدا کر دیا کرتی ہے، ہندوستان کا عام طبعی ذوق بلبل کی نواؤں سے آشنا نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ملک کی فضا دوسری طرح کی صداؤں سے بھری ہوئی تھی، یہاں پرندوں کی شہرت طوطے اور مینا کے پروں سے اڑی اور دنیا کے عجائبات میں شمار کی گئی۔"

اسی طرح ایک دوسری جگہ باورچی کی فراہمی اس کی پریشاں حالی اور رہائی کا تذکرہ

---

[1] تنقید اور عملی تنقید، صفحہ ۴۵۔

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے معلوم ہوا اطباع موعود یہی ہے۔

آخر آمد پسِ پردۂ تقدیر پدید

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی کہ آنے کو تو آگیا لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو، وہ کھاتا گیا پکاتا، اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگتا ہے...

اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

.......قید خانے میں جو اسے ایک رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا تو بھونتے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا، اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا تھا، قلعہ تک پہونچتے پہونچتے قلیہ بھی تیار ہوگیا۔"[1]

اس میں شک نہیں کہ مبالغے کا عنصر مولانا کے طنز کو بعض اوقات ایک طرفہ بنا دیتا ہے، اور حقیقت کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے مقصد اور اثر اندازی کے پیش نظر اور اپنے اخلاقی اور اصلاحی مقصد کے لئے، مولانا اپنی پوری قوت ایک خاص نکتے پر مرکوز کر دیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا چینی چائے (جو بغیر دودھ کے پی جاتی ہے) کا مقابلہ جب ہندوستان کی چائے نوشی سے کرتے ہیں تو اپنی پسند کو ترجیح دے کر ہندوستان

---

[1] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۲۰۔ [2] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۸۵-۸۴۔

کی چائے نوشی کے نسخوں کی مذمت ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں:

"سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے، تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی کہ انھوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی اور چونکہ ہندوستان میں چائے کا رواج ان ہی کے ذریعے سے ہوا اس لئے یہ بدعت سیئہ یہاں بھی پھیل گئی، رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہونچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کے بجائے دودھ میں چائے ڈالنے لگے۔

بنیاد ظلم در جہاں اندک بود، ہر کہ آمد برآں مزید کرد

اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہئے لیکن تخم فساد نے جو برگ و بار پھیلادیے ان کو کون چھانٹ سکتا ہے، لوگ چائے کی جگہ ایک طرح کا سیال حلوہ بناتے ہیں کھانے کی جگہ پیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چائے پی، ان نادانوں سے کون کہے کہ ؎

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

پھر ایک بنیادی سوال چائے کی نوعیت کا بھی ہے...... عام طور پر لوگ خاص طرح کی پتی کو جو ہندوستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے، سمجھتے ہیں چائے ہے اور پھر اس کی مختلف قسمیں کرکے ایک دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں...... حالانکہ ان فریب خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں وہ سرے سے چائے ہی نہیں...... ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا تھا

اگرچہ بغیر دودھ کی ہے مگر اچھی ہے یعنی بہتر چیز تو وہی دودھ والا
گرم شربت ہوا جو وہ روز پیا کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی چنداں بُری
بات نہیں، زمانے کی عالم گیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے ہیر ان کی
"صرف اچھی ہے" کی داد بھی مجھے غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی انہیں
بلا لیا کرتا تھا کہ آیئے ایک پیالی اس "اچھی ہے" کی بھی پی لیجئے

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است[۱]

مولانا کی یہ ہلکی پھلکی مزاح نگاری حد اعتدال سے اس لئے تجاوز نہیں
کرتی کہ اس کے اندر طنز کی ہلکی ہلکی سوئیاں چبھی ہوئی ہیں، اور اس کا مقصد
محض ہنسی کو فروغ دینا نہیں ہے، یہ ہنسی کے سوا کچھ اور چاہتی ہے، اس
طنز میں اگر مزاح کی آمیزش نہ کی جاتی تو یہ محض گالی بن جاتا اور وہ اثر
نہ پیدا کرتا جس کے لئے طنز کا حربہ استعمال کیا گیا ہے، چارنوشتی ہی کے
سلسلے میں جب مصری کو کوٹنے کے لئے قید خانہ میں ہاون دستہ کی ضرورت
محسوس ہوئی اور یہ مشکل ایک پرانا اور کرم خوردہ ہیہ المنظر ہاون دستہ مہیّا کیا جا سکا تو
مولانا اس پر اس طرح تبصرہ فرماتے ہیں:

"آج کل ٹاٹا نے ایک کتاب شایع کی ہے جو یہ خبر دیتی ہے کہ
ہزاروں برس پہلے وسط ہند کے ایک قبیلے نے ملک کو لوہے اور
لوہاری کی صنعت سے آشنا کیا تھا عجب نہیں کہ یہ ہاون دستہ
بھی اسی قبیلہ کی دستکاریوں کا بقیہ ہو اور اس انتظار میں
گردش لیل و نہار کے دن گنتا رہا ہو کہ کب قلعۂ احمد نگر کے
زندانیوں کا قافلہ یہاں پہونچتا ہے اور کب ایسا ہوتا ہے کہ سر

---

[۱] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۸۳-۱۸۴-

پھوڑنے کے لئے تیشہ کے بجائے ہاون دستہ کی ضرورت پیش آئے[1]"۔

مولانا کا یہ احساس مزاح قارئین کے لئے لطف انبساط کے اسباب فراہم کرنے کے علاوہ خود انھیں حقائق کی کرخت اور خوفناک صورت دکھا کر اس شدید مایوسی، انفعالیت اور پژمردگی سے بچاتا ہے جو ان کے رومانی خوابوں کی منزل پر ہمیشہ ان کی منتظر رہتی ہے اور انھیں کے سہارے وہ زندگی سے شکست کھانے کے بجائے اس سے باوقار سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، بقول ڈاکٹر وزیر آغا "انسان کائنات میں سب سے بڑا خواب پرست ہے اور اکثر و بیشتر اپنی امنگوں اور آرزوؤں کے تانے بانے سے ایک ایسا رنگ محل تیار کرتا رہتا ہے جس کی اساس محض خوابوں پر قائم ہوتی ہے، اس کے برعکس زندگی خواب ہو یا نہ ہو ایک سپاٹ اور ٹھوس حقیقت ضرور ہے، چنانچہ جب اس کی امنگوں اور آرزوؤں کے رنگ محل اس کرخت اور خوفناک حقیقت سے زود یا بدیر ٹکراتے ہیں تو وہ کائنات کی سب سے زیادہ بے بس اور غمزدہ ہستی بن جاتا ہے[2]" مولانا اپنی زندگی اور گرد و پیش کی کائنات کی سنجیدگی کو چند لمحات ہی کے لئے سہی، سانپ کی کینچلی کی طرح اتار پھینکتے ہیں، اور زندگی کے کھردرے کناروں کو ہموار کر لیتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کا سنجیدہ مزاج قہقہے کے ساتھ بے لطف ہو جائے گا، اسی لئے وہ صرف ہلکی اور زیر لب مسکراہٹ پر قناعت کرتے ہیں، قہقہہ لگا کر جذبات کا غیر معتدل مظاہرہ

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۸۷ [2] اردو ادب میں طنز و مزاح۔ اکاڈمی پنجاب ٹرسٹ لاہور طبع اوّل۔ صفحہ ۲۶ - ۲۷۔

کرنا انھیں اپنی انفرادیت کی توہین معلوم ہوتا ہے، ان کی ہنسی اس جذبۂ افتخار یا احساس برتری کی پروردہ ہوتی ہے جو بقول ہابز دوسروں کی کمزوریوں سے تقابل کے باعث معرضِ وجود میں آتی ہے[1]" اور یہی نہیں بلکہ موخر الذکر دونوں اقتباسات کے اندر مزاح کا جنم، اس ناہمواری کے وجود کو اچانک محسوس کر لینے کی بنا پر ہوا ہے جو تخیل اور حقیقت کے درمیان عموماً موجود ہوتی ہے اور یہ وہی کھیل کی جبلت (PLAY INSTINCT) ہے، جس کا سب سے بڑا کام بقول ایسٹ مین یہ ہے کہ وہ "انسان کو صدمے اور مایوسی کا ہنس کھیل کر مقابلہ کرنے کی ترغیب دے[2]" اپنی گرفتاری اور قیدوں کی طویل مدت کا ذکر مولانا غبارِ خاطر کے ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں:

"پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہ ہوگی، عمر کے تریپن[۵۳] برس جو گذر چکے ہیں ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب ہوتی ہے، گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گذرا، توراۃ کے احکام عشرہ میں ایک حکم سبت کے لئے بھی تھا، یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے، مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی سو ہمارے حصہ میں بھی سبت کا دن آیا، اس کے بعد

---

[1] HOBBES - HUMAN NATURE IN WORKS (MOLESWORTH 1840) VOL. IV P. 46

[2] EASTMAN - ENJOYMENT OF LAUGHTER 1937. ED. P 9

قید کے دو برس ۱۱ مہینے اور گذر گئے، اور مجموعی مدت سات
برس اور آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہو گئی اس اضافہ
کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا، البتہ اس کا افسوس
ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصہ کی مناسبت سے بات مختل
ہو گئی، اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا[1]

اس اقتباس میں مولانا نے اپنی زندگی کے ایک اہم اور سنجیدہ واقعہ کو جس نقش اور
مزاح کا موضوع بنایا ہے وہ وہی مزاح ہے جس کی تعریف "لی کاک" نے ان الفاظ میں
کی ہے "مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ
اظہار ہو جائے[2]" مولانا نے اپنی نگاہِ دوربیں سے زندگی کی ناہمواریوں کو دیکھا ہے اور
ان کی طرف سے ان کے رد عمل میں کوئی استہزائی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ
ان سے محظوظ ہوئے ہیں اور ان کی طرف ان کا زاویہ نگاہ ہمدردانہ ہے اور انھوں نے اپنے
تجربے کے اظہار میں فن کارانہ انداز بیان اختیار کیا ہے غبار خاطر میں بلا کی زندگی اور
زندگی سے انتہائی شغف کی ایک داستان مضمر ہے اور اسی چیز نے ان کے مزاح
میں بھی توانائی پیدا کر دی ہے ان کا مزاح بلند بانگ قہقہوں کا مزاح نہیں وہ مسکراتے
ہوئے زندگی کی بوالعجبیوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور پھر سنجیدہ ہو جاتے ہیں ان کی
انفرادیت ہر مقام پر اپنا وقار قائم رکھتی ہے، مولانا کی یہی خود دار انفرادیت
جذبات و حادثات کے پر شور طوفانوں سے گذر کر ایسے بلند مقام پر پہونچ جاتی
ہے جہاں سے وہ ایک تبسم زیر لب کے ساتھ کسی گذرتے ہوئے کارواں کو انتہائی

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ
[2] STEPHEN LEACOCK - HUMOUR & HUMANITY. P. 11

اطمینان کے ساتھ دیکھ سکتی ہے، اور لامحالہ زندگی کی طرف اس کے ردِ عمل میں بھی ایک اغماض و درگذر اور ایک بے نیازی اور وسعتِ نظر پیدا ہو جاتی ہے، مولانا کے ذہنی افق کی یہ وسعت اور زندگی کی تلخیوں کے مقابلے میں ان کا تبسم زیرِ لب ان کی عظمت میں اضافہ کے لئے سازگار ثابت ہوتا ہے، شاعرانہ مزاج کے حسین اور دلکش نمونے مولانا کے ادب میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں، یہی مزاج جو الہلال کے صفحات میں بڑھ کر جا بجا زہر خند کی صورت اختیار کر لیتا ہے، غبارِ خاطر کے صفحات میں اُبھر کر تبسم زیرِ لب تک آ کر رک جاتا ہے، یہ دراصل مولانا کے شاعرانہ احساسات کی گہرائی اور حقائق پر ان کی کڑی گرفت کا نتیجہ ہے اور اسی لئے ان کے مزاج میں خندۂ دنداں نما کے بجائے سوز و گداز کی ایک ہلکی سی یاس انگیز کیفیت کی لکیر بھی دکھائی دیتی ہے، زندگی کی نمود اور دنیا کی بد مذاقی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اپنے احساس کے اس سوز کو کوشش کے باوجود نہیں دبا پاتے۔

مناظرِ فطرت سے دلچسپی غبارِ خاطر کے صفحات میں ابوالکلام نے فطرت کے مظاہر و مناظر سے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اور پھولوں، پھلوں، پرندوں، بیل بوٹوں کی جو رنگین دنیا اس کتاب کے صفحات میں نقش پذیر ہوئی ہے ان سب سے ان کے رومانی مزاج، فطرت دوستی، قوتِ مشاہدہ اور جمالِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے وہ نہ صرف زندگی کے چھوٹے بڑے مظاہر کو گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں، بلکہ معمولی واقعات میں بھی بڑے بڑے مضمرات کا پتہ پا لیتے ہیں، رنگ و بو کا لطیف احساس اور مشاہدہ کی وسعت جس کا اظہار غبارِ خاطر کے صفحات پر

ہوا ہے، وہ مولانا کے ادب کا ایک مخصوص پہلو ہے، اس مطالعہ اور مشاہدہ کے اندر مولانا نے خود اپنے فلسفۂ زندگی اور عرفانِ حیات کے متعلق اپنی فکر و نظر کے متحرک نقوش کچھ اس طرح پیش کر دیے ہیں کہ ان کے ادب کے نفسیاتی پس منظر کا ایک گوشہ ظاہر ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کس انداز سے اور کس رُخ پر زیادہ سوچتے ہیں۔ مثلاً پھولوں کے ایک تختہ کو دیکھ کر ان کی طبع حساس پر جو نقوش اُبھرتے ہیں، اس کو صفحۂ قرطاس پر اس طرح منتقل کرتے ہیں:

"گلوری اور رسا سوپر پا...... کی شاخیں کلیوں سے لدی ہوئی ہیں، ان کا پھول پہلے پنجے کی طرح کھلے گا، پھر پیالے کی طرح اُلٹ جائے گا، پھر فانوس کی طرح مدور ہونے لگے گا، پھر تھوڑی دیر دم لینے کے لئے رُک جائے گا اور پھر دیکھیے کہ جن منزلوں سے گذرتا ہوا آیا تھا، انھیں منزلوں سے گذرتا ہوا الٹے واپس ہونے لگے گا، واپسی میں پہلے فانوس کی اُٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائیں گی، پھر اچانک یہ پیالہ اُلٹ جائے گا، گویا زندگی کے جام واژگوں میں اب کچھ باقی نہ رہا۔

لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

ہر پھول کی آمد و رفت کی یہ مسافرت دس بارہ دن کے اندر طے ہوا کرتی ہے، چھ دن آنے میں لگتے ہیں، چھ دن واپسی میں اور

۱؎ آثار ابوالکلام - صفحہ ۱۹۰

دراصل اس کا آنا بھی جانے ہی کے لئے ہوتا ہے ؎

ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی[1]

فطرت کے حسین مظاہر میں زندگی کے مضمرات کا پتہ لگا لینا اور حسین و خوبصورت بیل بوٹوں کو دیکھ کر تصورات کا رخ اپنے انفرادی مسائل اور زندگی کے بنیادی حقائق کی طرف موڑ دینا، مولانا کے مزاج کا خاصہ رہا ہے، بارنگ گلوری کے تختہ کی دلفریبیوں کا تذکرہ جس مصورانہ چابکدستی کے ساتھ مولانا نے کیا ہے اور اس منظر کو ذاتی مراقبہ کا جس انداز میں انھوں نے وسیلہ بنایا ہے، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

"کوئی پھول یاقوت کا کٹورا تھا، کوئی نیلم کی پیالی تھی، کسی پر گنگا جمنا کی قلم کاری کی گئی تھی، کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی، بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا، صناع قدرت کے موقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا، صاف کرنے کے لئے جھٹکنا پڑا، اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں، بہارِ صبح کی بیلیں برآمدے کی چھت تک پہنچا کر پھر اندر کی طرف پھیلا دی گئی تھیں چند دنوں کے بعد نظر اٹھائی تو ساری چھت پر پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں پھیل گئی تھیں لوگ پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں اور کروٹوں سے اسے پامال کرتے رہتے ہیں، ہمارے حصہ میں کانٹوں کا فرش آیا تو ہم نے پھولوں کی سیج

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۲۱۸

بستر سے اُٹھا کر چھت پر اُلٹ دی، تلوؤں کے کانٹے چُنتے رہتے ہیں مگر نگاہ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتی ہے۔[1]"

اسی طرح موسمی پھولوں کی بوقلمونیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"ان پھولوں کو موسمی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے، اور ادھر موسم ختم ہوا، اُدھر انھوں نے بھی دنیا کو خیرباد کہہ دیا، گویا زندگی کا ایک ہی پیراہن ان کے حصہ میں آیا تھا، وہی کفن کا کام بھی دے گیا، ..... بہار میں پھولوں سے درخت لد جاتے ہیں، خزاں میں غائب ہو جاتے ہیں پھر بھی جونہی موسم کا دور پلٹتا ہے دوبارہ آموجود ہوتے ہیں، مگر موسمی پھولوں کے پودوں کا شیوۂ یک رنگی و یک ساختی دیکھیے کہ جب ایک مرتبہ دنیا کو پیٹھ دکھا دی تو پھر دوبارہ مڑ کے نہیں دیکھنا چاہتے۔[2]"

مولانا کی نگاہیں صرف پھولوں کے جمالیاتی منظر پر پہونچ کر رک نہیں جاتیں بلکہ وہ ان کے رنگین حجابات کو چیرتی ہوئی ان عجائب آفرینیوں تک پہونچتی ہیں جہاں اپنے افعال و خواص کی نمائش روحِ انسانی کی طرح روحِ نباتاتی بھی کرتی ہے اور اس طرح ہر برگِ گل سعدی کی طرح ان کے لئے بھی معرفتِ کردگار کا ایک دفتر بن جاتا ہے، وہ پھولوں کی رنگت، ان کی تدریجی نشوونما سے آگے بڑھ کر ان عوامل کا بھی سائنٹفک نقطۂ نظر سے تذکرہ کرتے ہیں، جو ان کا تخلیق کا باعث بنتے ہیں، ایک پھول کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

---

[1] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۱۴ [2] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۲۱۷

"یہ پھول نباتات کی اس قسم میں داخل ہے جسے اتحاد تناسل کے لئے خارج کی مداخلت مطلوب ہوتی ہے، اور کبھی ہوا کے جھونکوں سے اور کبھی تتلیوں اور مکھیوں کی نشست و برخاست سے فطرت یہ کام لے لیا کرتی ہے، اس پھول کا جزو رجولیت اس کے انوثیت کے جز سے اس طرح بے تعلق واقع ہوا ہے کہ جب تک خارج کا ہاتھ مادہ تلقیح کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ نہ پہنچا دے تلقیح کا عمل انجام نہیں پا سکتا، جن پھولوں کو یہ خارجی اعانت مل جاتی ہے وہ باردار ہو جاتے ہیں، اور اپنا بیج چھوڑ جاتے ہیں جنھیں نہیں ملتی بانجھ ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں"[۱]

مولانا نے مناظر فطرت کی جو تصویر غبار خاطر کے صفحات پر کھینچی ہے اور جو تفصیلی جزئیات نگاری کی ہے، وہ روایتی نہیں ہے، بلکہ ان کا مشاہدہ گہرا باریک اور حقیقت پر مبنی ہے اور اس کے اندر ان کی بصیرت اور بصارت دونوں کا عمل دخل ہے، موسم بہار کا تذکرہ اور صحن چمن کی منظر کشی، جو اردو قصائد اور مثنویوں میں محض ایک رسمی چیز بن کر رہ گئی تھی وہ غبار خاطر کے صفحات پر آ کر حقیقت کا جامہ پہن لیتی ہے۔ وہ جب کسی مخصوص منظر یا شئے کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی نگاہیں اس کی ہر تفصیل اور اس کے ہر پہلو کو دیکھ لیتی ہیں اور ان کی یہ قوت مشاہدہ انگریزی کے رومانی شاعروں خصوصیت کے ساتھ ورڈس ورتھ کیٹس اور ٹینی سن کی یاد دلاتی ہے، ان کے یہاں نہ تو ملٹن کی جانب پائی جانے والی بد احتیاطی نظر آتی ہے اور نہ ان کا مشاہدہ کتابی اور تقلیدی ہے، بلکہ جس منظر کو انھوں نے دیکھا ہے اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں

---

[۱] غبار خاطر - ۲۱۵

میں کھینچ کر صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے، ایک جگہ زینیا کے تختوں کا ذکر کرتے ہیں:

"سامنے دو تختوں میں زینیا (ZINNIA) کے پھول رنگ برنگ کے صافے باندھے نمودار ہو گئے، زینیا کے پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں، یہ بڑے زینیا کے پھول تھے ان کے صافوں کی لپیٹ اتنی مرتب اور مدوّر واقع ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی مشّاق دستار بندے قالب پر چڑھا کر پیچوں کی ایک ایک سلوٹ نکال دی ہے، جوں جوں عمر بڑھتی گئی صافوں کی ضخامت بھی بڑھتی گئی اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے پہرہ داروں کی صفیں رنگ برنگ کی پگڑیاں باندھے کھڑی ہیں[1]۔"

منظر نگاری کا یہ انداز، اور جزئیات کی تفصیل پیش کرنے کا یہ اسلوب، کسی بڑے فن کار کی مصوّرانہ چابک دستی کی یاد دلاتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی شخصیت کے اندر شاعر، مغنّی، مصوّر اور فلسفی کی روح حلول کر کے ایک اکائی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ جب گل و غنچہ اور صحن و روش کی دنیا سے نکل کر مناظر فطرت کی وسیع اور بیکراں فضاؤں کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہیں، تو ان اسلوب میں وہ روانی، فصاحت اور بلاغت پیدا ہو جاتی ہے جس کا سراغ آیات قرآنی کے اس لحن و ترنم میں ملتا ہے جو بقول علی سردار جعفری بچپن سے ان کے خون میں رچ بس گیا تھا[2]۔ قید و بند کی محروم زندگی میں اپنی کامرانیوں کا راز اپنے دل زندہ کی ان دھڑکنوں کو بتلاتے ہیں جن کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑتی، وہ اپنے لذتیہ فلسفۂ حیات کی عشرت اندوزیوں کا رشتہ مناظر فطرت کی رنگینیوں سے ملا دیتے ہیں، اور لکھتے ہیں:

---

[1] غبار خاطر - صفحہ ۲۱۵ [2] انوار ابوالکلام - صفحہ ۱۷۳

"قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا، اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیران قید و محن کو بھلی بنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں، جب صبح طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادر پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی...... جس قید خانہ میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردہ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے"[1]

ان کے نزدیک فطرت کا کام انسانوں کی طرح یہ نہیں ہے کہ کسی کو شاد کام رکھے اور کسی کو محروم کر دے بلکہ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دے دیتی ہے، یہ ہماری آپ کی غلط روی اور غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے، اور صرف

---

[1] غبار خاطر - صفحہ ۹۳ - ۹۲

اپنے گرد و پیش میں کھوئے رہتے ہیں، اب ذرا اس فلسفۂ حیات اور حقیقی مسرتوں کے اس سامان کا سراجو فطرت نے ہر مخلوق کے لئے پیدا کر دیا ہے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے حسب ذیل اقتباس سے ملائیے، اور دیکھیے کہ دونوں میں کس قدر مماثلت ہے، قدرت کے سامانِ راحت و سرور کا تذکرہ کرتے ہوئے، مولانا لکھتے ہیں:

"جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو، جس دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، اور شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزیّن اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو، جس کی بہار سبزہ و گل سے لدی ہوئی اور جس کی فصلیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گرانبار ہوں جس دنیا میں روشنی اپنی چمک، رنگ، اپنی بوقلمونی، خوشبو اپنی عطر بیزی اور موسیقی اپنا نغمہ و آہنگ رکھتی ہو، کیا اس دنیا کا کوئی باشندہ آسائش حیات سے محروم اور نعمت معیشت سے مفلس ہو سکتا ہے[1]"

غبار خاطر اور ترجمان القرآن کے ان دونوں اقتباسات کا تقابلی مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ نہ صرف نفس موضوع کے اعتبار سے، بلکہ اسلوب بیان اور اندازِ تحریر کے اعتبار سے بھی دونوں میں کافی مماثلت ہے، حقیقت یہ ہے کہ صحائف آسمانی کا اسلوب بیان مولانا کے رگ و ریشہ میں اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ ان کا انداز تحریر کہیں بھی اس اسلوب بیان کی زد سے نہ بچ سکا، چاہے وہ الہلال کا بلند آہنگ خطیبانہ انداز ہو یا غبار خاطر کی

---

[1] ترجمان - جلد اوّل - صفحہ ۹۳ - ۶۲ -

سبک رو، جوئے رواں، ترجمان اور غبارِ خاطر دونوں میں فطرت کے افادۂ فیضان کی سب سے بڑی بخشائش، اس کا عالمگیر حسن و جمال ہے، فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بنائے میں حسن و زیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمود پیدا ہو گئی ہے ستاروں کا نظام اور ان کی سیر و گردش، سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اس کا اُتار چڑھاؤ، فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات سبزہ کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب، حیوانات کے اجسام اور ان کا تنوع، نباتات کی صورت آرائیاں اور باغ و چمن کی رعنائیاں، پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی، صبح کا چہرۂ خنداں اور شام کا جلوۂ محجوب، غرض کہ تماشہ گاہ ہستی حسن کی نمائش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے۔

فلسفۂ حیات

ابوالکلام کے مزاج کی تشکیل میں خاندانی و موروثی عناصر کے علاوہ دورِ مغلیہ کے تہذیبی، ثقافتی اور ادبی قدروں نے بھی برابر کا حصہ لیا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ عربی ذوق و ذہن کے ریشے بھی سختی کے ساتھ ان کے مذاق میں پیوست تھے، چنانچہ ان کی زندگی کا وہ فلسفہ جس کی ترجمانی غبار خاطر کے صفحات پر ہوئی ہے اس میں یقین محکم اور عمل پیہم کے ساتھ ساتھ وسیع المشربی اور رنگین مزاجی کا بھی عجیب و غریب امتزاج ہوا ہے، اس میں اسلام کی دینی اور عقلی روایات کے ساتھ ساتھ تصوف کی چاشنی اور وجدان کی لذتیں بھی شامل ہیں، انھوں نے عشق مجاز سے لے کر عشق مقاصد تک کی تمام منزلیں طے کی

تھیں، فسق یو الحاد کی کوئی ایسی قسم نہ تھی جس سے ان کا نامۂ اعمال خالی رہا ہو، انھوں نے جس طرف نظر اُٹھائی تھی، ایک صنم آباد الفت و پرستش نظر آیا تھا، ہر راہ میں زنجیریں اور کمندیں، اور ہر گوشے میں زندانِ ہوش و آگہی آباد تھا، مگر اسی کے ساتھ ساتھ جب چارہ فرمائے غیبی کی کارسازیاں شامل حال ہوئیں تو وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے، اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ، ہوشیاری بینش، کا مرقع اور بصیرت و معرفت کا درس تھا، انھوں نے اپنی زبردست قوت ارادی سے محبت کے مرکز کو بدلا تھا، اور شدید جذبات کو عقیدہ و فکری قوت سے مطیع و مقید کیا تھا، جذبۂ محبت کے اس انقیاد کا نتیجہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ "محبت ذوق و نظر کی لطافتوں کا روپ اختیار کر لیا کرتی ہے اور کسی مقام و مرکز کی قید سے بلند ہو کر عمومیت کا شیوہ اختیار کر لیتی ہے عشق کے اس مسلک میں پہونچ کر عاشق کسی ایک فرد کا عاشق نہیں ہوا کرتا، بلکہ وہ حسن کے ہر رنگ کا پرستار ہو جاتا ہے، اور حسن کی ہر شکل اپنے آپ کو اس پر جلوہ گر کرتی ہے، نیچر کا حسن، الفاظ کا حسن، خط و خال کا حسن، آب و رنگ کا حسن، آواز کا حسن، بیان کا حسن، بلکہ حقائق و معانی کا حسن غرض حسن اپنی رنگا رنگ صورتوں میں اس پر اوروں سے زیادہ منکشف ہو جاتا ہے"[1] غبار خاطر کے اوراق اسی آتشِ بے باک کے اندر تپ کر نکھرے ہیں، جن کو مولانا کی عالی فطرت نے گل و گلزار بنا لیا ہے، ان کی طبع بوقلموں کی نیرنگ آرائیاں کبھی بکھراں دریاؤں

---

[1] ماحول آزاد نمبر۔ ستمبر ۱۹۵۸ء۔

میں پیرتی ہے، کبھی لکڑی کے بڑے بڑے کندے آتش داں میں بھڑکتے ہوئے دیکھتی ہے، کڑاکے کی سردی، تلخ چائے، یہ سب عشق بے کنار کے قیامت خیز جذبوں کے بدلے ہوئے رنگ ہیں جن کو عقیدے کی قوت اور مقاصد کے اٹکاؤ نے نئے نئے رنگ عطا کر دیے ہیں راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے، وہ رہرو کے جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لئے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ اور وہ زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے بلند ہو کر دیکھنے لگتا ہے، ضبط و انقیاد کا یہ مرحلہ جب پیش آتا ہے تو ابتدا میں اس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں، طبیعت میں مقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ صورت حال سے دب جائے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک پرجوش نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور عملی زندگی کی تلخیوں کی طرف ایک رواقی بے پروائی پیدا ہو جاتی ہے، اور رنج و الم کی تلخیاں خوشگواریوں کا مزہ دینے لگتی ہیں۔ لیکن جب جذبات کی خود فراموشیوں کا نشہ اترتا ہے تو طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگتی ہیں اور صورت حال کا ایک کانٹا پہلوئے دل میں چبھنے لگتا ہے، مولانا نے طبیعت کی اس انفعالی حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے، ایک خاص طرح کا سانچہ ڈھال لیا تھا، قید خانہ سے باہر کی زندگی میں ایک طرح کی خود رفتگی اور خود مشغولی ہمیشہ ان کی طبیعت پر چھائی رہی، لیکن جب حالات کی رفتار قید و بند کا پیغام لائی، انھوں نے اپنے آپ کو یک قلم بدل ڈالنے کی کوشش کی، اس مبدل صورت کے عمل نے ان کی قید و بند کی زندگی کو ایسے قالب میں ڈھال دیا تھا جس کا دستور العمل "ہر وقت

خوش رہو اور ناگوار حالت کو خوشگوار بناؤ" تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے قیدخانہ کی زندگی دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے، اس میں ایک جزء رواقیہ (STOICS) کا ہے، ایک لذتیہ (EPICUREANS) کا۔

پنبہ را آتشی ایں جا بہ شرار افتاد است

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں..... جہاں تک زندگی کی خوش گواریوں کا تعلق ہے لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں..... میں نے اپنے کاک ٹیل کے جام میں دونوں بوتلیں انڈیل دیں، میرا ذوق بادہ آشامی بغیر اس جام مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا، اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھئے کہ گویا حکایت بادۂ و تریاک میں نے تازہ کر دی ہے۔[۵]"

وہ خوش رہنے کو محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری بھی سمجھتے ہیں، اس لئے کہ ہماری انفرادی زندگی کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے اس لئے ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں، وہ لکھتے ہیں:

"ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے یہاں ہر چہرے کا عکس

---

۵ غبار خاطر۔ صفحہ ۹۱۔

بیک وقت سیکڑوں آئینے میں پڑنے لگتا ہے، اگر ایک چہرے
پر بھی غبار آ جائے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے
ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے،
وہ پورے مجموعے کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے،
لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں......
ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں
کو خوش دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں[1]۔"

مولانا اس عام رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل
اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہو گا
یہ زندگی کی تحقیر اور توہین ہے، وہ زہد خشک اور طبع خشک کی گرم بازاری کو
نظامِ فطرت اور منشائے قدرت کے خلاف سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس
مرقع میں کھپ نہیں سکتے، جو نقاش فطرت کے موقلم نے
یہاں کھینچ دیا ہے، جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند
کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں
کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم، اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی
جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں، اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور
سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے مستحق نہیں
ہو سکتے، فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے
جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۹۸-۹۷

رکھتی ہو اور چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں
میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی
طرح کھِل کر اپنی جگہ نکال سکتی ہو۔[۱]

زندگی کو ان سانچوں میں ڈھالنے کا عمل بڑی قربانی کا متقاضی ہوتا ہے،
اس کے لئے زبردست قوتِ ارادی اور محکم عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے،
یہ اسی وقت مقاصد کا جامہ پہن سکتی ہے جب عقاید بھی جذبوں کی صورت
میں ڈھل جائیں، یہ شعلوں سے کھیلنے اور دامن کو بچا لینے کا فن ہے، یہ وہ
کارِ شیشہ و آہن ہے جس میں ایک طرف محکم سپیدگی اور دوسری طرف
رواتی بے نیازی کے اجتماع کی ضرورت پیش آتی ہے، ابوالکلام کے
مزاج میں یہ تضادات شیر و شکر ہو گئے ہیں، اور کاک ٹیل کے اسی جام مرکب
کا بخشا ہوا نشہ ہے جس کی سرمستیوں میں ڈوب کر ابوالکلام زندگی اور مقصد
کے طوفانوں کو بڑی دلیری اور کامیابی سے عبور کر گئے انھوں نے اپنی
فطرت کی شورشوں اور طوفانی کیفیتوں کو ضبط و تنظیم کے ایسے سانچوں
میں ڈھالا جس میں نہ صرف ان کی طبعی شورشیں اور شدتیں آسودہ ہو سکیں
بلکہ دوسری طرف لطافتوں کا موزوں رنگ بھی اُبھر آیا، جذبات کے اس
طوفانی سمندر میں کسی اٹکاؤ، کسی لگاؤ، کسی بندھن اور کسی لنگر کی ضرورت
ہوتی ہے، اور اسی لئے زندگی کسی مقصد کے بغیر بسر نہیں کی جا سکتی،
ابوالکلام کی تسکین ایک خشک اور نا آشنائے شورش مقصد سے نہ ہو سکتی
تھی، انھیں ایسے مقصد کی ضرورت تھی، جو اضطراب کے انگاروں پر
دہک رہا ہو، جو ان کے اندر شورش و سرمستی کا ایک ہنگامہ مچا دے جس کے

---

[۱] غبار خاطر - صفحہ ۱۰۰ - ۹۹ -

دامنِ ناز کو پکڑنے کے لئے وہ ہمیشہ اپنا گریبان وحشت چاک کرتے رہیں، یہ ایک ایسا بلائے جان مقصد ہو جس کے پیچھے انھیں دیوانہ وار دوڑنا پڑے جو دوڑنے والوں کو ہمیشہ نزدیک بھی دکھائی دے اور ہمیشہ دور بھی ہوتا ہے نزدیک اتنا کہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیں، دور اتنا کہ گردِ راہ کا بھی سراغ نہ پا سکیں کیونکہ زندگی کا مزہ انھیں کو مل سکتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ پیتے ہیں جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں نہ بسر ہو، پانے کا مزہ انھیں کو مل سکتا ہے جو کھونا بھی جانیں، اس لئے کہ زندگی کی حقیقت اضطراب ہے اور سکون موت کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ زندگی مختصر سہی، اسی مختصر زندگی کو بسر کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے، کتنے صحراؤں کو طے کرنا پڑتا ہے، کتنے سمندروں کو لانگنا پڑتا ہے، کتنی چوٹیوں سے کودنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کے آتش و پنبہ کا افسانہ اور برق و خرمن کی کہانی مکمل ہوتی ہے، اور ابوالکلام کی زندگی اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی، وہ لکھتے ہیں:

"اپنی سرگذشت و روئداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمود غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ حیات قلم بند ہو تو کیونکر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اڑتا ہے، طوفان نے درخت گرا دئے، سیلاب نے عمارتیں بہا دیں، عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے تنکے جمع کئے، خرمن و برق کا معاملہ، آتش و خس کا افسانہ، ان سب کی سرگذشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے،

میری پوری سوانح عمری بھی انھیں میں مل جائے گی، نصف
افسانہ امید اور نصف ماتمِ یاس[1]۔"

اور شاید یہی وجہ ہے کہ "خوش رہو اور خوش رہنے دو" کے مقولے پر عمل کرنے کے باوجود ان کی طبیعت ایک دائمی دردمندی، اور دل فگاری سے بہرہ مند ہے، قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران میں بار بار ان کی نگاہیں اس قبر کی طرف اُٹھتی ہیں جو احاطہ کی شمالی کنارے پر واقع ہے، وہ لکھتے ہیں:

"احاطے کے شمالی کنارے میں ایک پُرانی قبر ہے، نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتیں، قبر کے کنارے ایک چھوٹا سا طاق ہے، طاق اب چراغ سے خالی ہے مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا۔"

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

..... سبحان اللہ! اس روزگارِ خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتی ہیں، اس پرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لئے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو[2]۔"

اور یہی نہیں بلکہ جب وہ اپنی اہلیہ کے انتقال کی روح فرسا خبر سنتے ہیں تو اس قبر سے ایک عجیب طرح کا اُنس پیدا ہو جاتا ہے، وہ ایک دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں:

---

[1] تذکرہ صفحہ ۱۱۴ [2] غبار خاطر۔ صفحہ ۵۵۔

"یہاں احاطے کے اندر ایک پُرانی قبر ہے، نہیں معلوم کس کی ہے، جب سے آیا ہوں سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے، لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئی طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہے کل شام کو دیر تک اسے تکتا رہا، اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا تھا"[1]

یہ درد مندی اور دل دوزی، عشق مفرط کی اسی آتش بیباک کے اندر سے اُٹھتی ہے جس کو ان کی عالی فطرت نے گلہ بیدار دیا تھا، علی سردار جعفری نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

"وہ پروانہ کے دل کی تپش لے کر اٹھے اور شمع کے دل کا گداز بن گئے یہ آگ مولانا کو شفق کے رنگ میں بھی دکھائی دی، اور پھولوں کے نقش و نگار میں بھی، اسے انھوں نے عارضِ محبوب میں بھی پایا اور لیلائے وطن کے پیکر میں بھی، اور وہ ہمیشہ اسی آگ کی طرف لپکتے رہے"[2]

دراصل ان کی طبیعت کا بنیادی خمیر ہی عشق و جنوں کی شورشوں سے اٹھا تھا، عشق کی یہ تیغ جگر دار طبع انسانی کے ایک بے غرض جزو کی حیثیت سے ان کے ضمیر میں داخل ہو گئی تھی، جس کو علم و آگہی کے نیام نے چھپا رکھا تھا، اور اسی نے ان کی طبیعت کو ایک دائمی درد مندی، سرشاری اور دل فگاری سے آشنا کر دیا تھا، جس کا اظہار انھوں نے کئی جگہ غبار خاطر

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۲۵۵ [2] آزاد ابوالکلام۔ صفحہ ۱۶۹۔

کے صفحات پر کیا ہے، مگر ان کی اس دل دوزی اور دل دگاری کا کوئی علاقہ پژمردگی و انفعالیت، افسردگی و تنگی سے نہیں ہے، اس لئے زندگی کے جن مقاصد کے پیچھے وہ والہانہ دوڑے اس کے کانٹے دامن سے اُلجھے اور تلوؤں میں چبھے ضرور، لیکن مقصد کی خلش جو پہلوئے دل میں چبھتی رہی اس نے کبھی اس بات کا موقع ہی نہ دیا کہ دامن کی خبر لی جائے، یا زخمی تلوؤں کی، ان کو زندگی کا بوجھ اٹھا کر کانٹوں کے فرش پر دوڑنا پڑا، اس لئے کہ یہ تقاضے دیبا و مخمل کے فرش پر چل کے پورے نہیں کئے جا سکتے تھے، مولانا لکھتے ہیں:

"کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم پھولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں اور اس کی ہر چبھن میں راحت و سرور کی ایک نئی لذت پانے لگتے ہیں..... راحت و الم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دیا کرتا یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے، کبھی مرہم بن جاتا ہے طلب و سعی کی زندگی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذت ہے بشرطیکہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو۔"[1]

جب دوسرے کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے، انھوں نے تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹوں کا انتخاب کیا اور اسی جام کی سرشاری میں زندگی بھر بے خود رہے، وجہ محض یہ تھی کہ زندگی کی ناگواریوں کو گوارا بنانے کے لئے مقاصد کے سوز دروں نے انھیں سہارا دیا تھا، اور مذہب نے تسکین، ایسی تسکین جو سلبی نہ تھی بلکہ ایجابی تھی، مذہب نے انھیں یہ بتلایا تھا کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہئے، ایک بوجھ ہے

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۶۷۔

جسے اٹھانا چاہیے، مصائب و ابتلا کے گہرے اور تاریک طوفانوں کے درمیان مذہب کی ایک روشن اور نورانی قندیل بھی فروزاں تھی جس کی کرنیں انھیں سکون و طمانیت بخش رہی تھیں۔ انھوں نے کبھی اپنے دل کو مرنے نہ دیا، کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہ پڑی وہ جانتے تھے کہ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدہ خلوت کے دم سے ہیں، یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی، اسی لئے اس دنیا کو قائم و دائم رکھنے کے لئے وہ طرح طرح کی تدابیر اختیار کرتے ہیں، کبھی وہ طبیعت کی افسردگیوں کا چائے کے گرم جاموں سے علاج کرتے ہیں کبھی آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کر نظارہ کرتے ہیں اور رواقِ دل کا دریچہ کھول دیتے ہیں کیونکہ "گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں[1]"

کارخانۂ وجود ۱۷ اور ۱۸ اکتوبر کے دو خطوط میں یکایک مولانا کا ذہن خدا کی ہستی اور کارخانۂ وجود کے معمے کو حل کرنے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے اور کیوں ہے اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں، یہ کہیں جاکر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے، یہ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ انسان کیا ہے تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے، یہ تمام مسائل ان کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتے ہیں، وہ اس گورکھ دھندے کو مرتب انداز اس قفل

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۹۶۔

ابجد کو کھولنا چاہتے ہیں، انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمہ کا حل ڈھونڈھ رہا ہے لیکن اسرار ازل کا کچھ سراغ نہ پا سکا، علم و دانش کی تجربہ گاہیں ہزاروں باتیں معلوم کر لیتی ہیں، مگر اس ضمن میں قدم قدم پر نئے مرحلے اور نئے سوالات سامنے آتے ہیں، ایک پردہ ہٹتا ہے تو دوسرے پردے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ایک راز حل ہوتا ہے تو سو نئے راز چشمک کرنے لگتے ہیں، علم کی ساری کدوکاوش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ اگر پچھلی گتھیاں سلجھتی ہیں تو نئی نئی گتھیاں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر ایک نہ بجھنے والی پیاس ہر وقت کھولتی رہتی ہے جو اس معمائے ہستی کا کوئی حل چاہتی ہے، یورپ اور امریکہ کے مفکرین جو دوسری جنگ عظیم کے قبل اس دھوکے میں پڑے ہوئے تھے کہ اس مسئلے پر کسی تشفی بخش حل کی ضرورت نہیں جنگ کے بعد حیران و سراسیمہ نظر آتے ہیں اور وہ مذہب اور وجود باری کے مسئلے پر از سر نو غور و خوض کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مولانا کے نزدیک عقل کے سہارے اور علم کی روشنی ایسا حل فراہم کرنے سے قاصر ہیں جو اس اُلجھاؤ کے سارے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ برخلاف اس کے کائنات کے تمام اعمال و مظاہر اور نظام ربوبیت کا موجود ہونا ہر انسان کو وجدانی طور پر یہ یقین دلاتا ہے کہ ایک صاحبِ ادراک و ارادہ قوت پس پردہ موجود ہے۔" اور جب یہ یقین ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تو صورت حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے ہر سوال نے اپنا جواب پا لیا ہو اور ہم اندھیرے سے نکل کر یکایک اُجالے میں آ کھڑے ہوئے ہوں، مولانا لکھتے ہیں:

"فطرت کائنات میں ایک مکمل مثال (PATTERN) کی نمود داری

ہوتی ہے، ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور جمالی بھی، اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے، اس کا جمال ہم میں محویت پیدا کرتا ہے پھر کیا ہم فرض کرلیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی پیدا رک (INTELLIGENT) قوت کے کام کر رہی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ فرض کر لیں مگر نہیں کر سکتے، ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایسا فرض کر لینا ہماری دماغی خودکشی ہوگی۔"[1]

مولانا نے اس مسئلے پر انسان کی اس خواہش سے بھی دلالت کی ہے کہ اسے لامحدود بلندیوں کا ایک بام رفعت چاہیے جس کی طرف وہ برابر دیکھتا رہتا ہے اور جو اسے ہر دم بلند سے بلند تر ہونے کا اشارہ کرتا ہے، مولانا کے نزدیک بلندی کا یہ نصب العین خدا کی ہستی کے تصوّر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان عناصر کے درجے سے بلند ہو کر نباتاتی زندگی کے درجے میں آیا، نباتات سے بلند ہو کر حیوانی زندگی کے درجے میں پہونچا، اور پھر حیوانی مرتبے سے اڑ کر انسانیت کی شاخِ بلند پر اپنا آشیانہ بنایا، اب وہ اس بلندی سے پھر نیچے کی طرف نہیں دیکھ سکتا، مولانا لکھتے ہیں:

"اس کے اوپر اجرام سماوی کی موجودات پھیلی ہوئی ہیں لیکن ان میں بھی کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جو اس کے لئے نصب العین بن سکے، وہ سورج کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا، وہ چمکتے ہوئے ستاروں سے عشق نہیں کر سکتا، سورج اس کے جسم کو گرمی بخشتا ہے لیکن اس کی مخفی قوتوں کی امنگوں کو گرم نہیں کر سکتا، ستارے

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۳۶۔

اس کی اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں لیکن
اس کے دل و دماغ کے نہاں خانے کو روشن نہیں کر سکتے پھر
وہ کون سی ہستی ہے جس کی طرف وہ اپنی بلند پروازیوں کے لئے
نظر اُٹھا سکتا ہے..... بلندی کا یہ نصب العین خدا کی
ہستی کے تصور کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے[۱]"

راز کائنات جاننے کا مطالبہ انسان کی ہستی کا ایک فطری مطالبہ ہے اور اس کا
فطری جواب خود اس کی ہستی کے اندر موجود ہے اور یہ جواب خدا کی ہستی پر
یقین کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

۸ ار اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں مولانا نے اپنا رخ اسی مسئلہ کے دوسرے
پہلوؤں کی جانب پھیر دیا ہے، انھوں نے اس سوال پر غور کیا ہے کہ آخر
کیوں انسان خدا کے ماورائے تعقل اور غیر شخصی تصور پر قانع نہ رہ سکا،
اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر و احساسات کے مطابق ایک شخصی تصور پیدا
کرتا رہا، اس کی وجہ بھی محض یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی کے ایک
نصب العین کی ضرورت ہے، اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک تشخص اور
علائق لوازِ تصور کے بجھ نہیں سکتی، مولانا فرماتے ہیں:

"حقیقت کچھ ہی ہو، لیکن یہ تصور کبھی اس کے سامنے آئے گا
تو تشخص کی ایک نقاب چہرے پر ضرور ڈال لے گا، یہ نقاب
کبھی بھاری رہی، کبھی ہلکی ہو گئی کبھی ڈرانے والی رہی، کبھی
لبھانے والی بن گئی، لیکن چہرے سے اُتری کبھی نہیں، اور

---

[۱] غبار خاطر - ۱۳۸ - ۱۳۷ -

یہیں سے ہمارے دیدۂ صورت پرست کی درماندگیاں شروع ہوگئیں۔"[1]

اس مرحلے پر پہونچنے کے بعد مولانا نے وحدت الوجود کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے جس نے ہندوستان سے نکل کر یونان اور اسکندریہ کو بھی متاثر کیا یہ صحیح ہے کہ یہ عقیدہ حقیقت کے تصوّر کو ہر طرح کے تصوّری تشخصات سے منزّہ کرتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ اس تصوّر کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں، اور نہ ہوتی بھی ہیں تو تعینات اور مظاہر کے اعتبار سے نہ کہ ذاتِ مطلق کی ہستی کے اعتبار سے۔ اسی طرح یہودیوں نے خدا کو ایک قاہر و جابر شہنشاہ کی صورت میں دیکھا اور اسرائیل کے گھرانے سے اس کا رشتہ ایسا ہوا جیسا ایک غیور شوہر کا اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ ہوتا ہے مسیحیت نے شوہر کی جگہ باپ کو دیکھا مگر اسلام نے اپنے عقیدے کی بنیاد تنزیہہ پر رکھی اور لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ میں تشبیہ کی ایسی عام اور قطعی نفی کر دی کہ ہمارے تصوّری تشخص کے لئے کچھ بھی نہ رہا، مولانا لکھتے ہیں:

"تاہم انسان کے نظارۂ تصوّر کے لئے اسے بھی صفات کی ایک صورت آرائی کرنی ہی پڑی اور تنزیہہ مطلق نے صفاتی تشخص کا جامہ پہن لیا...... اور پھر صرف اتنے ہی پر معاملہ نہیں رُکا، جا بجا مجازات کے جھروکے بھی کھولنے پڑے۔"[2]

دراصل غیر صفاتی تصور انسانی دماغ کو پکڑ نہیں سکتا اور بقول مولانا "طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آسکے، وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسن گریزاں کے پیچھے

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۴۱ [2] غبار خاطر ۱۴۲۔

والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لئے اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھا سکے، جس کے ساتھ راز و نیاز محبت کی راتیں بسر کر سکے جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے جھانک لگائے تاک رہا ہو[1]۔"

اس کے بعد اس ضمن کے اور بھی سوالات مولانا کے ذہن میں اپنا سر اٹھاتے ہیں، اگر یہاں مادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو پھر مرتبۂ انسانی میں ابھرنے والی وہ قوت جسے ہم فکر و ادراک کے نام سے پکارتے ہیں، کیا ہے؟ کس انگیٹھی سے یہ چنگاری اُڑی؟ اور پھر خود وہ صورت حال جسے ہم نشو و ارتقا سے تعبیر کرتے ہیں کیا ہے اور کیوں ہے، یہ تمام باتیں، یہ نشو و ارتقا ایک معین طے شدہ ہم آہنگ اور منظم، ارتقائی تقاضہ ہے جو تمام کارخانۂ ہستی پر چھایا ہوا ہے، اور اسے ایک خاص رخ کی طرف اٹھائے اور بڑھائے لئے جا رہا ہے، فطرت وجود میں رفعت طلبیوں کا تقاضا یقیناً کسی بالاخانے کی موجودگی کا ثبوت ہے، یہ بالاخانہ اور یہ مقام نظر، مولانا کے نزدیک اس سے بلند تر ہے کہ عقلی نظر و تعلیل سے اس کی نقش آرائی کی جا سکے وہ ماورائے محسوسات ہے اگرچہ محسوسات معارض نہیں، وہ ایسی آگ ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی البتہ اس کی گرمی سے ہاتھ تاپ لئے جا سکتے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:

"یہ سچ ہے کہ یہ راہ محض استدلالی ذریعۂ علم سے طے نہیں کی جا سکتی، یہاں کی اصل روشنی کشف و مشاہدہ کی روشنی ہے لیکن اگر ہم کشف و مشاہدہ کے عالم کی خبر نہیں رکھنی چاہتے جب بھی حقیقت کی نشانیاں اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں اور اگر غور کریں تو

---

[1] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۱۴۵ - ۱۴۶۔

خود ہماری ہستی ہی سرتاسر نشانِ راہ ہے"۔[1]

مولانا کے یہ دونوں خطوط، نفس موضوع اور طرزِ تحریر دونوں کے اعتبار سے ترجمان القرآن کے حواشی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں بارہا ان الفاظ اور جملوں کی تکرار سنائی دیتی ہے جو ترجمان القرآن جلد اول میں بہ ضمن تفسیر سورۂ فاتحہ اور جلد دوم میں بہ ضمن تفسیر فلا تضربوا اللہ الامثال بیان کئے گئے ہیں، مولانا کی طرزِ تحریر موضوع کے مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور یہ دونوں خطوط غبارِ خاطر کے عام رنگ سے الگ ہو کر ترجمان القرآن کے رنگ سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتے ہیں اور وہی باتیں جو ترجمان القرآن میں تفصیل کے ساتھ آئی ہیں یہاں پر اختصار کے ساتھ موجود ہیں ہم ذیل میں ترجمان القرآن اور ان خطوط کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیے، دونوں میں کس قدر مماثلت ہے، مولانا تنزیہہ اور تعطیل کا فرق بتلاتے ہوئے ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں:

"بلاشبہ اپانی شد تنزیہہ کی "نیتی نیتی" کو بہت دور تک لے گئے لیکن عملاً نتیجہ کیا نکلا، یہی نہ کہ ذات مطلق (برہماں) کو ذات متشخص (ایشور) بیں) اُتارے بغیر کام نہ چل سکا"۔[2]

یہی بات غبارِ خاطر میں یوں بیان ہوئی ہے:

"ہندوستان کے اپانیشدوں نے نفی صفات کی راہ اختیار کی اور تنزیہہ کی "نیتی نیتی" کو بہت دور تک لے گئے لیکن پھر دیکھیے اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذات مطلق) کو ایشور (ذات متصف و متشخص) کی نمود

---

[1] غبارِ خاطر۔ صفحہ ۱۵۱-۱۵۰
[2] ترجمان جلد اول۔ صفحہ ۱۶۹۔

دیکھنے لگے۔[1]"

اسی طرح یہودی تصور خدا کا ذکر کرتے ہوئے ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں:۔

"خدا کا انسان سے رشتہ اس نوعیت کا رشتہ ہوا جیسے ایک شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے، شوہر نہایت غیور ہوتا ہے وہ اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا لیکن یہ جرم معاف نہ کرے گا کہ اس کی محبت میں کسی دوسرے مرد کو شریک کرے۔[2]"

غبار خاطر میں یہی بات اس انداز میں آئی:

"اسرائیل کے گھرانے سے اس (خدا) کا رشتہ ایسا ہوا جیسا ایک غیور شوہر کا اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ ہوتا ہے، شوہر اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا مگر اس کی بے وفائی کبھی معاف نہیں کرے گا، کیونکہ اس کی عزت گوارا نہیں کرتی کہ اس کی محبت کے ساتھ کسی دوسرے کی محبت شریک ہو۔[3]"

ان اقتباسات کا تقابلی مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ان دونوں خطوط میں ترجمان القرآن کے ایک مخصوص موضوع کا اعادہ کیا گیا ہے، اور جملوں کی ساخت، الفاظ کے انتخاب میں بھی کوئی خاص اضافہ نہ ہو سکا ہے۔ خدا کے وجود پر وہی طریقہ استدلال استعمال کیا گیا ہے جو انسان کے فطری وجدان و ذوق کا پروردہ ہے، اگر یہ وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثبات مدعا کے لیے بحث و تقریر کی ضرورت نہ ہو گی، خود اس کا وجدان ہی اسے مدعا تک پہنچا دے گا، انسان کی فطرت ہی انسان پر حجت ہے۔

---

۲ ترجمان جلد اول۔ صفحہ ۱۶۱۔ ۳ غبار خاطر۔ صفحہ ۱۴۳-۱۴۲۔

ژواین وِل کی کتاب پر ریویو

۲۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء کا مکتوب ایک فرانسیسی مجاہد ژیرے آں وہ ژواین ویل کی اس یادداشت کا ریویو ہے جس میں پانچویں صلیبی حملے کی سرگزشت بیان کی گئی ہے مولانا کے بیان کے مطابق یہ کتاب ایک رفیقِ زنداں سے ان کو ملی تھی اور بہت عرصے کے بعد انھیں اس کتاب کو دیکھنے کا پھر اتفاق ہوا تھا، اس کتاب کے مصنف نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ سینٹ لوئس شاہ فرانس کے ہمراہ گذارا تھا، وہ جب شاہ فرانس کے ساتھ روانہ ہوا تھا تو اس کی عمر پچاسی برس کی تھی، اور جب اس نے اپنی کتاب MEMOIRS OF THE CRUSADES مرتّب کی تو اس کی عمر پچاسی برس کی ہو چکی تھی، اور صلیبی حملے کے واقعات پر پچاسی سال کی مدت گذر چکی تھی، لیکن اس کے باوجود اس کے بیانات جہاں تک واقعات جنگ کا تعلق ہے عام طور پر صحیح اور قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں، اس نے مسلمانوں کے دینی عقاید و اعمال کے بابت جو بیانات دیئے ہیں وہ کم، اور مصری حکومت اور اس کے ملکی اور فوجی نظام کے بابت جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ صحیح ہیں، اس مکتوب میں مولانا نے خصوصیت سے ساتھ ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، جس کا راوی بھی ژواین ویل ہے۔ اس نے ایک شخص (VEVOLA BRETAN) کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو لوئی کے ایک سفیر کے ہمراہ سلطان دمشق کے پاس بطور مترجم بھی گیا تھا۔ اس نے لکھا ہے:

”لابرتان کو راستے میں ایک مسلمان بڑھیا عورت ملی، اس کے داہنے ہاتھ میں ایک برتن آگ کا تھا، بائیں ہاتھ میں پانی کی صراحی تھی، لابرتان نے اس عورت سے پوچھا ”یہ چیزیں کیوں اور کہاں

لے جا رہی ہو؟" عورت نے کہا "میں چاہتی ہوں اس آگ سے جنت کو جلا دوں اور پانی سے جہنم کی آگ بجھا دوں تاکہ پھر دونوں کا نام و نشان باقی نہ رہے لا برتان نے کہا "تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو؟" اس نے جواب دیا "اس لئے تاکہ کسی انسان کے لئے اس کا موقع باقی نہ رہے کہ جنت کے لالچ اور جہنم کے ڈر سے نیک کام کرے، پھر وہ جو کچھ کرے گا، صرف خدا کی محبت کے لئے کرے گا۔"

ہو بہو یہی عمل اور یہی قول دوسری صدی ہجری کی مشہور صوفیہ حضرت رابعہ بصریؒ کے ساتھ منقول ہے، مولانا نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے اور یہ سوال اُٹھایا ہے کہ دوسری صدی ہجری کی رابعہ بصریہؒ کا یہ مقولہ کسی طرح ساتویں ہجری کی ایک زبان پر طاری ہو گیا، کیا یہ محض افکار و احوال کا توارد ہے یا تکرار اور نقالی ہے؟ یا پھر راوی کی افسانہ تراشی؟ مولانا نے اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے اور ہر ممکن توجیح پر روشنی ڈالی ہے، اسی طرح ایک دوسرا واقعہ جو تروا این دیل نے لکھا ہے، وہ دی اولڈ مین آف دی ماؤنٹین کی سفارت ہے، مولانا نے اس کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، شیخ الجبال کا لقب سب سے پہلے حسن بن صباح نے اختیار کیا اور پھر اس کا ہر جانشین اسی لقب سے پکارا جانے لگا، فرقہ باطنیہ کی دعوت کا یہ عجیب و غریب نظام، تاریخ عالم کے غرائب حوادث میں سے ہے، یہ بغیر کسی بڑی فوجی طاقت کے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک قائم رہا، اور مغربی ایشیا کی تمام طاقتوں کو اس کی ہولناکی کے سامنے جھکنا پڑا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"اس نے یہ اقتدار فوج اور مملکت کے ذریعہ حاصل نہیں کیا بلکہ جانفروش فدائیوں کے بے پناہ قاتلانہ حملے تھے جنھوں نے اسے ایک ناقابل تسخیر طاقت کی حیثیت دے دی تھی، وقت کا کوئی بادشاہ، کوئی وزیر، کوئی امیر، کوئی سربرآوردہ انسان ایسا نہ تھا جس کے پاس اس کا پراسرار خنجر نہ پہونچ جاتا ہو اس خنجر کا پہونچنا اس بات کی علامت تھی کہ اگر شیخ الجبال کی فرمائش کی تعمیل نہیں کی جائے گی تو بلا تامل قتل کر دئے جاؤ گے[1]"

مولانا نے ژواین ویل کے اس بیان کی صداقت پر بحث کی ہے کہ شیخ ٹمپل اور ہاسپٹل کو ایک سالانہ رقم بطور خراج ادا کرتا تھا، کیونکہ وہ اس قاتلانہ حملوں سے بالکل نڈر تھے، اور انھیں کے اثرات کی بنا پر فرانس بادشاہ کے پاس دوستانہ خطوط اور تحائف لے کر اس کے سفیر آئے تھے" ژو ویل کی یہ روایت مولانا کے نزدیک محل نظر ہے اس لئے کہ عرب مورخین تصریحات اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔ اور شواہد و قرائن اس بات کی نہیں کرتے، اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد مو نے خود ژواین ویل کے بیانات کی توجیہہ کی ہے اور مسئلہ کو حل کر کوشش کی ہے کہ شیخ الجبال کون تھا، اسی سلسلۂ مباحث میں مولانا ژواین ویل کی لکھی ہوئی ان باتوں کی تردید کی ہے جو اس نے مسلما کے دینی عقائد اور اعمال کے بارے میں لکھی ہیں اور جن کا ماخذ کے کلیسائی حلقے اور اس کے ذاتی تعصبات ہیں، مولانا کا یہ خط خا

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۶۱۔

علمی اور تحقیقی طرز تحریر میں لکھا گیا ہے، اس میں نہ تو جابجا اشعار کا استعمال ہوا ہے اور نہ قرآنی آیات کا سہارا لیا گیا ہے بلکہ شروع سے آخر تک مسلسل اور مدلل گفتگو مسائل زیر غور، اس کے مباحث اور متعلقات سے ہوئی ہے، اس میں ان کے اصلی طبعی رنگ کا عمل دخل کم اور ان کے اکتسابی رنگ کی جھلک زیادہ ہویدا ہے۔

انانیتی ادب

اسی طرح سے ۹ رجنوری ۱۹۴۳ء کا وہ مکتوب جس میں مولانا نے انانیتی ادب پر تفصیلی بحث کی ہے اپنے علمی موضوع اور طرز تحریر کی بنا پر اپنی جانب ہماری توجہ مبذول کراتا ہے، مولانا کا ذہن اس موضوع کی جانب کس طرح مبذول ہوا اس کی بابت مولانا کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

"کل ایک زیر تسوید کتاب کا ایک خاص مقام لکھ رہا تھا کہ بحث کی مناسبت سے قول مندرجہ (فقلت لہا "ما اذنبتُ قالت مجیبۃ وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب) صبح ذہن میں تازہ ہو گیا اور اس وقت حسب معمول صبح کو لکھنے بیٹھا تو بے اختیار سامنے آ کھڑا ہوا، آیئے، آج تھوڑی دیر کے لئے رک کر اس معاملہ پر غور کر لیں[1]۔"

اپنی ذاتی دنیا سے نکل کر علم و فن کا کوئی مبحث، کسی فلسفیانہ غور و فکر کی کوئی کاوش، طبعیات کا کوئی نیا نظریہ، تصوف و اشراق کی واردات کو موضوع سخن بنا لینا مولانا کے لئے وہ صورت حال ہے جسے وہ "تخمیص" کی اصطلاح سے تعبیر کیا

---

[1] غبار خاطر - صفحہ ۱۹۸-۱۹۷-

کرتے ہیں، انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر گاہ گاہ وہ اس تخمیص کا موقع نہ نکالتے رہیں تو ان کا دماغ بے کیف اور خشک مشغولیتوں کے بارے تھک کر معطل ہو جائے، وہ معاً اپنے گرد و پیش کی دنیا سے نکل آئیں گے، اور ایک انقلابی تحول کے ساتھ اپنے آپ کو علم و فن کے حصار میں لے لیں گے، اجمل خاں نے مولانا کے مزاج کی ایک واضح کیفیت کی نشاندہی اس وقت کی جب انھوں نے یہ لکھا کہ:

> "انھیں اپنی طبیعت کے انفعالات پر غالب آنے اور اپنے آپ کو اچانک بدل لینے کی جو غیر معمولی قدرت حاصل ہو گئی ہے وہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے[1]"

وہ بڑی آسانی کے ساتھ سیاسی ہنگاموں سے منھ موڑ کر شعر و ادب کی دنیا میں پناہ لے لیتے تھے، سنجیدہ موضوعات سے ہلکے پھلکے موضوعات کی طرف آجانا اور ہلکے پھلکے موضوعات کو چھوڑ کر سنجیدہ علمی، ادبی، مذہبی اور تحقیقی مضامین کی طرف تمام تر سنجیدگی کے ساتھ مائل ہو جانا ان کے لئے ایک معمولی واقعہ تھا، انھوں نے اپنے جذبات و احساسات پر قابو پا لینے کا اتنا زیادہ ریاض کیا تھا کہ شدید سے شدید خارجی واقعات ان کے معمولات پر اثر ڈالنے سے قاصر رہتے تھے، دریا سے ہم عنانی کا شوق اور آگ کے شعلوں سے تشنگی بجھانے کی خواہش، نقطۂ انجماد کا جاڑا اور آتش دان میں بھڑکتے ہوئے لکڑی کے بڑے بڑے کندوں کے شعلے، ان کے مزاج کے دو رخ نہیں بلکہ ایک ہی رخ کی تصویریں تھے، تضادات میں ہم آہنگی اور اختلافات میں ربط باہمی کی تلاش ان کے رومانی مزاج کی غمازی کرتے

---

[1] مقدمہ غبار خاطر - صفحہ ۱۳ -

کے ساتھ ساتھ، ان کے اپنے جذبات و احساسات پر اختیارات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ ۷، جنوری ۱۹۴۳ء کا خط ذاتی مراقبات، افتادِ طبع اور چینی چائے کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے، اور دو دن کے بعد بغیر کسی تمہید کے وہ انانیتی ادب اور اس کے متعلقات سے بحث کرنے لگتے ہیں۔ سارا ماحول یکایک بدل جاتا ہے، بے تکلفی کی وہ بزم اور ذاتی اعترافات کا وہ سلسلہ جو گذشتہ خط میں ملتا ہے ختم ہو جاتا ہے، اور تمام تر علمی و ادبی سنجیدگی کے ساتھ ان کا وہی قلم ایک علمی مسئلہ کے اوپر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ پوری فضا بدل جاتی ہے نہ صبح کی مجلس طرب باقی رہ جاتی ہے اور نہ احوال و کوائف کی عکاسی، اور وہ تمام تر سنجیدگی کے ساتھ انانیتی ادب اور اس کے متعلقات پر خامہ فرسائی کرنے لگتے ہیں، یہ موضوع چونکہ خود ان کے مزاج کے مطابق تھا، اس لئے اس کا تجزیہ، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے، ان کے ذہن و دل کے دریچوں پر روشنی بکھیرتا ہے، وہ خود اپنے دور کا سب سے بڑا انگو تھے اور ضمیر غائب و ضمیر مخاطب کے سارے پردوں میں ان کے ضمیر متکلم کی پرچھائیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، چنانچہ وہ ایک عام تخیلی زاویہ نگاہ سے لے کر فلسفہ و اخلاق کے مذہب انا اور خودی کی مصطلحہ تصوف کے ہر گوشہ پر اجمالی انداز سے بحث کر ڈالتے ہیں، انانیت ان کے نزدیک فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے دبایا نہیں جا سکتا، اور اگر کوئی اسے دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ اُبھرنے لگتی ہے۔ ابوالعلا معری کا لامیہ قصیدہ، ابو فراس حمدانی کا الافانی رائیہ، ابن سنا الملک کے اشعار فردوسی کا یہ ادعا کہ "عجم زندہ کردم بدیں فارسی" نل و دمن میں فیضی کے اپنے

متعلق اشعار، اور اسی طرح کے دیگر اکتسابات شعر و ادب مولانا کے
نزدیک محض شاعرانہ تعلیاں نہ تھیں بلکہ ایک پُرجوش انفرادیت تھی جو صحیح
معنی تھی، مگر جس طرح ہر انسان کا ذہن و ادراک یکساں درجہ کا نہیں ہوتا اسی
طرح انفرادیت کا جوش بھی ہر دیگ میں ایک ہی طرح نہیں اُبلتا، اکثروں
کی انفرادیت دھیمے سُروں میں بولتی ہے، بعضوں کی اتنی پرجوش ہوتی ہے کہ
سارا گرد و پیش گونج اُٹھتا ہے، کچھ ایسے اخص الخواص بھی ہیں جن کی انانیت
کی مقدار اضافی نہیں ہوتی بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے اور زمانے کو ان کا
یہ حق تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ چاہیں "میں" بولتے رہیں، سینٹ آگسٹائن
روسو، اسٹرنڈبرگ، ٹالسٹائی، اناطول فرانس، آندرے ژید، غزالی، ابن خلدون
بابر، جہانگیر، ملا عبدالقادر بدایونی، ان سب کی تحریروں میں ان
کی انانیتیں بے پردہ بولتی ہے، اور چونکہ بغیر کسی بناوٹ کے ہمارے
سامنے آتی ہیں، اس لئے ہم ان کی دل آویزی سے متاثر بھی ہوتے ہیں،
ان کے نظریات و عقاید کو ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر ہم انھیں پڑھتے ہیں، وجہ
محض یہ ہے کہ جس شخص کی یہ تصویریں ہیں وہ چاہے خود خوبصورت رہا ہو یا نہ رہا
ہو لیکن تصویر بہ حیثیت تصویر کے بے ساختہ اور خوبصورت ہے، مولانا کے اس خط کا
رنگ بھی وہی ہے جو ان خطوط کا ہے جن میں مولانا نے مذہب، فلسفہ اور تاریخ سے
بحث کی ہے، اس میں وہی اسلوب نگارش اختیار کیا گیا ہے جو موضوعات زیر بحث
کے شایان شان ہے، اور ان عنوانات کی سنجیدگی اور ٹھوس واقعیت کا متحمل ہو سکتا
ہے، اس میں شک نہیں کہ موضوع زیر بحث کی نوعیت کے اعتبار سے مولانا کا
اسلوب بیان بدلتا رہتا ہے فلسفیانہ مسائل اور ادبی رموز کی گرہ کشائیوں میں
عموماً ان کا اسلوب صاف اور سادہ رہتا ہے جیسا کہ اس خط میں

موجود ہے، اندازِ تحریر میں یہاں نہ تو طبلِ جنگ ہے اور نہ جوار بھاٹے کا سمندر، نہ تو ہلکا پھلکا شیریں اور لطیف نغمہ پیدا کرنے والی آبجو ہے اور نہ سبک پھیلے اور ٹھنڈے خطوط، نہ تخیل کی خابندی ہے اور نہ سماج اور سیاست کی خونچکاں داستان بلکہ دونوں کے درمیان ٹھوس اور بھرپور معنویت سے پُر رواں نثر ہے جس میں ادبی وقار اور تمکنت کے ساتھ ایک علمی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے، اپنے علمی خطوط میں علمی اصطلاحات علاوہ مولانا نے جا بجا انگریزی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال بھی کیا ہے اور ان کے اردو ترجمے کا بھی التزام کیا ہے مثلاً۔

MATAMORPHISM	تحوّلِ صورت
ENVIRONMENT	احوال و ظروف
AESTHETIC	جمالی
NEOPLATONISM	مذہب افلاطون جدید وغیرہ وغیرہ

یہ صحیح ہے کہ مولانا کے یہ ترجمے آج رائج نہیں ہیں اور ان کے بجائے دوسرے الفاظ رائج ہو گئے ہیں مگر آج سے کچھ دنوں پہلے ان ترجموں کی بڑی اہمیت تھی۔

چڑیا چڑے کی کہانی

چڑیا چڑے کی کہانی میں جس قوتِ مشاہدہ تفصیلی جزئیات نگاری اور منظر کشی کا سروسامان کیا گیا ہے، وہ اردو نثر میں ایک خاصہ کی چیز ہے، چڑیوں کے منہ میں انسان کی زبان رکھ کر ان کی گفتگو سے نتائج و عبر کے دفاتر کھول دینا اور تمثیلی اندازِ نگارش میں عبرت و مواعظت کے موتی لٹا دینا مختلف زبانوں کے ادب میں جانی پہچانی چیز رہا ہے، لیکن مولانا نے قلعۂ احمد نگر کے ایک کمرے میں ان کی زندگی اور افعال کا مطالعہ کر کے زندگی کی کرشمہ سازیوں

کا جو تماشہ دکھلایا ہے اور جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ آپ اپنی مثال ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے قلم کی تمام تر رنگینی اور نشتریت کے ساتھ ساتھ انھوں نے چڑیوں کا جو سراپا کھینچا ہے اور جس خشوع خضوع کے ساتھ ان کے ذہن و وجدان کا مطالعہ کیا ہے اس کی مثال ہمارے ادب میں نہیں ملتی، یہ صحیح ہے کہ احمد نگر میں ان کو فراغت کے لمحات میسّر تھے' اور ان کی طبیعت داستان سرائیوں سے تھکنا بالکل بھول گئی تھی، داستانیں جتنی پھیلتی تھیں' ان کا ذوقِ داستاں سرائی اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا، مگر صرف فرصت و فراغت کے لمحات ہی ایسی زندہ جاوید تصویریں بنانے کے لئے درکار نہیں ہوتے' اس کے لئے عادات و اطوار کے مطالعہ اور مشاہدہ کے ذوق کے علاوہ زبان و بیان پر اس قدرت کی ضرورت بھی پیش آتی ہے' جو ابوالکلام کے حصّہ میں آئی تھی' اس کہانی میں ہم مولانا کی زندگی کا ایک ایسا رُخ دیکھتے ہیں جو مخصوص فطری رجحانات اور نہایت بیدار قوت مشاہدہ کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا' قاضی عبدالغفار کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ "مولانا نے چڑیا چڑے کی کہانی میں اپنے ادیبانہ افکار کو کچھ اس قدر پھیلا دیا ہے کہ اس مخروطی آئینہ کے جس پہلو کو دیکھئے زندگی کی ایک تصویر نظر آتی ہے۔"[۱] اس خط میں مولانا نے گرہ ہوا کے ان سیلانیوں سے اپنی راہ و رسم پیدا کرنے کی داستان پوری تفصیل کے ساتھ سنائی ہے' آغاز کار کی دقتوں سے لے کر ان کو مانوس بنانے تک کی تمام منزلیں درجہ بدرجہ مولانا نے بیان کی ہیں۔ باورچی خانہ سے کچّا چاول منگوا کر وہ سامنے

۱؎ آثار ابوالکلام ۔ صفحہ ۱۹۲ ۔ ۲؎ آثار ابوالکلام ۔ صفحہ ۱۹۲ ۔

دری پر چھڑکتے ہیں، کچھ دیر تک تو چڑیوں نے اس کی جانب توجہ نہیں کی، مگر دانوں کی کشش ایسی بھی نہ تھی کہ ان کا تغافل دیر تک قائم رہتا، پہلے ایک چڑیا آئی اور اِدھر اُدھر کودنے لگی، پھر دوسری اور تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی، کبھی دانوں پر نظر پڑتی، کبھی دانہ ڈالنے والے پر، آخر کار خدا خدا کرکے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے، اور ایک بتِ طناز نے صاف صاف دانوں کی طرف رُخ کیا، مگر یہ رُخ بھی کیا قیامت کا رُخ تھا، ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے، ایک قدم آگے بڑھتا تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے، ...... التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جراتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلہ کار کی درازی سے اکتا کر بے باکانہ قدم اٹھا دیا، اور زبان حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا ؎

زدیم بر صفِ رنداں و ہرچہ بادا باد

اس ایک قدم کا اُٹھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے اچانک رُکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے، اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب، مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا[1]

واقعہ کے اس موڑ پر پہنچ کر مولانا یکایک اپنے کیمرے کا رُخ زندگی کے ایک مخصوص پہلو کی طرف موڑ دیتے ہیں اور اس واقعہ میں قارئین کو زندگی کے عرصۂ کارزار میں ایک خاص درس لینے کی طرف متوجہ کرتے ہیں، فرماتے ہیں:-

---

۱؎ غبار خاطر - صفحہ ۱۳۳ -

"غور کیجئے تو اس کارگاہ عمل کے ہر گوشے کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں، جب تک یہ نہیں اُٹھتا، سارے قدم زمین پر گڑے رہتے ہیں، یہ اُٹھا اور گویا ساری دنیا اچانک اُٹھ گئی

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

اس بزم سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لئے نہیں بھرا گیا، وہ ہمیشہ انھیں کے حصّہ میں آیا جو خود بڑھ کر اُٹھا لینے کی جرارت رکھتے تھے[1]"

یہ جرأت اپنی رندانہ جرأتوں اور بے باکانہ اقدامات کی بنا پر مولانا کی اپنی فطرت اور افتاد طبع سے میل کھاتا ہے وہ خود اس میں اپنی زندگی کا ایک رُخ دیکھتے ہیں، بے دماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی وہ اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے، مولانا اس سے ربط ضبط بڑھاتے ہیں مزاج کی ہم آہنگی دونوں کے اندر قدر مشترک بن جاتی ہے، منطق الطیر کی کہانی آگے بڑھتی ہے تکلفات کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور یاران سقف و محاریب مولانا کے سر کو اپنے قدموں کی جولانگاہ بناتے ہیں، اور رفتہ رفتہ ہتھیلی کی خاک تائے پر اتر کر منقارانداز یاں شروع کر دیتے ہیں،

مولانا ان کے الگ الگ نام رکھ دیتے ہیں، ملا اور صوفی کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کسی اور ضمن کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے، موتی کے بچوں نے کس طرح قوت پرواز حاصل کی اور قانون قدرت کس طرح عمل میں آیا؟ اس کی توضیح مولانا کی زبان سے سنئے :-

---

[1] غبار خاطر - صفحہ ۲۳۳ -

"پھر جوں جوں بچوں کے پر بڑھنے لگتے ہیں، وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ماں کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب انھیں اڑنے کا سبق سکھانا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے موتی کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی، ایک دن صبح کو کیا دیکھتا ہوں، گھونسلے سے اڑتی ہوئی اتری تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا، موتی بار بار اس کے پاس جاتی اور اڑنے کا اشارہ کر کے اوپر کی طرف اڑنے لگتی، لیکن بچے میں اثر پذیری کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی، وہ پر پھیلائے آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت پڑا تھا، میں نے اسے اٹھا کے دیکھا تو معلوم ہوا ابھی پر پوری طرح بڑھے نہیں ہیں ...... بہر حال اسے اٹھا کر دری پر رکھ دیا، موتی چاول کے ٹکڑے چن چن کر منھ میں لیتی اور اسے کھلا دیتی، وہ منھ کھولتے ہوئے چوں چوں کی ایک مدھم اور اکھڑی سی آواز نکال دیتا، اور پھر دم بخود آنکھیں بند کیے پڑا رہتا، پورا دن اسی حالت میں نکل گیا، دوسرے دن بھی اس کی حالت ویسی ہی رہی ماں صبح سے لے کر شام تک برابر اڑنے کی تلقین کرتی رہی مگر اس پر کچھ ایسی مردنی سی چھا گئی تھی کہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ میرا خیال تھا یہ اب بچے گا نہیں، لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا، دھوپ کی ایک لکیر کمرے کے اندر دور تک چلی گئی تھی، یہ اس میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا، پر گرے ہوئے، پاؤں مڑے

ہوئے، آنکھیں حسب معمول بند تھیں، اچانک "کیا دیکھتا ہوں
کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے، پھر
گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا، پھر گرے ہوئے
پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا، بند کیا اور پھر جو ایک مرتبہ
جست لگا کر اڑا تو یک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہونچا اور
پھر ہوا کی طرح فضا میں اڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔"

بے حالی اور درماندگی سے لے کر آسمان پیمائیوں کے اس انقلاب انگیز
جوش تک، مولانا نے موتی کے بچے کی حرکات و سکنات کا جس تفصیل کے ساتھ
مشاہدہ و مطالعہ کیا ہے، وہ ایک بہت بڑا مصور ہی کر سکتا تھا اور یہ کہنا بھی
شاید مبالغہ نہ ہو کہ اس کی تفصیلی جزئیات کی منظر کشی کرنے کے لئے مصور سے
زیادہ فوٹوگرافی کی ضرورت پیش آتی ہے، عام انسانی نگاہ میں یہ تدریجی تبدیلیاں
مشکل سے آسکتی ہیں، اس کے لئے مصور کے موقلم سے زیادہ متحرک فلموں کے
آلۂ انعکاس کی ضرورت ہے، اتنی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو دیکھنا، ذہن میں
باقی رکھنا اور پھر اسے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دینا مولانا ہی کے بوتے
کی بات تھی، اردو نثر میں یہ منظر کشی تو شاذ و نادر ہی ملے گی، شاعری میں
نظیر، انیس، میر حسن بھی شاید اس حد تک حق ادا نہ کر سکتے، مولانا کے نزدیک
یہ پورا منظر زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا، اس چڑیا کے
بچے میں اڑنے کی استعداد ابھر چکی تھی، مگر ابھی تک اس کی خود شناسی کا
احساس بیدار نہیں ہوا تھا، وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا، ہاں بار بار
اشارے کرتی تھی، ہوا کی لہریں بار بار پروں کو چھوتی ہوئی گذر جا

تھیں، زندگی اور حرکت کا ہنگامہ ہر طرف سے آ آ کر بڑھا دیتا تھا، لیکن اس کے اندر کا چولھا کچھ اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ باہر کی کوئی گرمجوشی بھی اسے گرم نہیں کر سکتی تھی، مگر یکایک اس کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوئی" اور یہ تبدیلی مولانا کے الفاظ میں یہ تھی کہ "جوں ہی اس کی سوئی ہوئی خودشناسی جاگ اُٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ "میں اُڑنے والا پرندہ ہوں" اچانک قالب بے جان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی، گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی سہار نہیں سکتے تھے، اب تن کر سیدھے ہو گئے تھے، وہی گرے ہوئے پر، جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی اب سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے، چشم زدن کے اندر جوش پرواز کی ایک برق دار تڑپ نے اس کا پورا جسم ہلا کر اچھال دیا اور پھر جو دیکھا تو درماندگی اور بے حالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور مرغِ ہمت عقاب دار فضائے لامتناہی کی لا انتہائیوں کی پیمائش کر رہا تھا..... گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری بے بالی دپری سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا، غور کیجیے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانے کا خلاصہ ہے"۔

مولانا نے اس کہانی میں اپنی داستان حیات کے کچھ گوشے اور اپنی ہی فکر و نظر کی کچھ چلتی پھرتی تصویریں اس انداز میں پیش کی ہیں کہ ان کے نفسیاتی پس منظر کا ایک گوشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے مولانا کا یہ فلسفہ خودشناسی علامہ اقبال کے فلسفہ خودی سے بڑی حد تک

۵۔ غبار خاطر - ۲۴۷ - ۲۴۶ -

ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

مولانا چڑے چڑی کی کہانی میں تمام عالمِ انسانیت کو جس حرکت و عمل کا پیغام دیتے ہیں وہ وہی پیغام ہے جو شاہین و شہباز کے رموز و علائم ہیں علامہ اقبالؔ بڑی حد تک مسلمانوں کو دیلئے ہیں، بقول قاضی عبدالغفار مولانا کا فلسفہ حیات اقبالؔ کے تصورات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے، وہ اقبالؔ سے زیادہ مذہبی ہونے کے باوجود خود شناسی کے فطری تقاضوں کو انسانیت حتیٰ کہ ہر جاندار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور چڑیا کے بچے کے لئے بھی خود شناسی کا تقاضا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا انسانوں کے لئے۔[1]

ذوق چائے نوشی اور نغمہ و موسیقی سے دلچسپی

غبار خاطر کے وہ حصے جس میں مولانا نے اپنے ذوق چائے نوشی، نغمہ و موسیقی سے دلچسپی اور اپنے تخیل عیش کو پیش کیا ہے، دراصل وہی حصے ہیں جس میں مولانا کے سدابہار قلم نے تضاد شعر و شریعت کو ہم آہنگ کر دیا ہے، یہی وہ مقامات ہیں جہاں پر نسرین و نسترن کی کلیاں کھلی ہیں اور مولانا کے جذبہ و تخیل کے شگفتہ پھول مسکرائے ہیں، اپنی نظر بندی اور قید و بند کے ابتدائی ایام میں انھوں نے کتاب الٰہی کی تفسیر لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھایا جس میں اسلام کے نامور علما اور مصنفین نے قید خانہ کی چہار دیواری کو قلم کی روانی کی جولانگاہ بنایا، یہ روایت امام ابوحنیفہؒ کی روایت تھی، جنھوں نے بغداد کے محبس میں بیٹھ کر امام محمدؒ سا شاگرد پیدا کیا

---

[1] آثار ابوالکلام۔ صفحہ ۱۹۱-۱۹۰۔

یہ روایت امام حنبلؒ کی روایت تھی جنھوں نے معتصم کے قیدخانہ میں مجلس درس کو گرم رکھا یہ قاضی بکار مصری کی روایت تھی جنھوں نے ابن طولون کے زندانِ مصر میں ایک کھڑکی سے منھ نکال کر علم کے شائقین کو تعلیم دی، یہ امیہؒ بن عبدالعزیز اندلسی کی سنت تھی جنھوں نے اسکندریہ کے قید خانہ میں ہیئت و ریاضی کی متعدد تصانیف چھوڑیں، علامہ ابن تیمیہ، شمس الائمہ سرخسی، مفتی عنایت احمد، مولانا فضل حق خیرآبادی یہ سب کے سب اسی روایت میں منسلک نظر آتے ہیں جس کی کڑی ابوالکلام کے ترجمان القرآن سے ملتی ہے، مگر کتاب دل کی تفسیر لکھ کر مولانا نے اپنی آخری اسیری کے زمانہ میں جو روایت قائم کی اس میں نہ تو سیاسی مقاصد سے لدی ہوئی کشتیاں مذہبی بادبانوں کے سہارے چلتی ہیں، اور نہ مذہبی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے سیاسی ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں، بلکہ یہ قوس و قزح کے مدھم رنگوں کی دنیا ہے، یہ تخیل کی ایک موج خوش آب ہے جو اپنے آئینے میں خود کو دیکھتی اور سنورتی ہے اس دنیا میں صبح مسکراتی ہے، سمندر اچھل اچھل کرناچتا ہے، نسیم صبح کے جھونکے پھولوں کی خوشبو چن کر سمندر کو بھیجتے ہیں تاکہ وہ اپنی لہروں کے ذریعہ سے فضا میں پھیلاتا رہے، یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں اور نہ صبر کی گریز پائیاں، یہاں طبیعت کی افسردگیوں کا علاج چائے کے گرم جاموں سے کیا جاتا ہے، یہاں مصنفؒ خود اپنے کھوئے ہوئے دل کو ڈھونڈتا ہے جس کے اندر عیش و مسرت کا سارا سامان بھرا ہوا ہے، یہاں برقی روشنی کے کنول نہیں ہیں بلکہ راتیں ستاروں کی قندیلوں سے جگمگاتی ہیں، صبح طباشیر بکھیرتی ہے، شفق فضا کو گلگوں بناتی ہے۔ چاندنی جلوہ فروشیاں کرتی ہے اور زندگی کی ساری رونقیں مصنفؒ کے خلوت کدہ

دل میں بھر دیتی ہے، یہاں فصیلِ قید و بند میں جسم ضرور گرفتار ہے، مگر دل کی دنیا آباد ہے، اس پر مصنّف کے اپنے اختیارات و تصرّفات ہیں، اس کی تڑپ دھیمی نہیں پڑتی، اور یہ خرابہ عیش و طرب کی سرمستیوں سے معمور رہتا ہے، اور چائے کے فنجانوں میں جامِ صبوحی کا مزہ ملتا ہے، ملاحظہ فرمائیے :-

"میں ہمیشہ تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں..... یہ وقت میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُرکیف وقت ہوتا ہے،..... میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں، پھر جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا..... قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا ..... پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا، اور کچھ نہ پوچھئے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہونچ جاؤں گا، کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صدسالہ تہہ خانوں کے عرقِ کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیّا کرتا ہے..... میں جرعہ کشاں کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا، پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لئے رک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لئے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دوں گا..... اور دنیا کو اور اس کے

کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔[1]

اور اگر روسی فنجانوں اور چینی چائے کے گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے غبار آلود ہوتے ہیں تو پھر مولانا جامِ فطرت کی شراب لنڈھانے لگتے ہیں :۔

"میرا دوسرا پر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے..... لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جاتا ہوں، پھر اُٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں....

اس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور رواقِ دل کا ایک دریچہ کھول دوں گا، گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں[2]"

اور یہ سب محض اس لئے کہ مولانا کے نزدیک خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔

چائے کا تذکرہ مولانا نے جس اہتمام اور لذت کے ساتھ کیا ہے، اس کی مثال دنیا کے ادب میں مشکل سے ملے گی، ان کے جغرافیے میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لئے نہیں کہ جنرل چنگ کاشک اور میڈم چنگ وہاں سے آئے تھے بلکہ اس لئے کہ چائے وہاں سے آتی ہے۔

اور یہ چائے جس کے وہ عادی ہیں وہائٹ جیسمین (WHITE JASMINE)

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۹۵۹ [2] غبار خاطر۔ صفحہ

کہلاتی ہے یہ یاسمن سفید یا گوری چنبیلی کیسی ہوتی ہے، اس کا بیان مطالعہ
اس طرح کرتے ہیں :۔

"اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اتنا ہی کیف تند و تیز ہے، رنگت کی نسبت کیا کہوں، لوگوں نے آتشِ سیال سے تعبیر کیا ہے۔

مے میانِ شیشہ، ساقی بنگر　　　　آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے، اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں[1]۔"

اور صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ سورج کی ان کرنوں کو دو آتشہ بناتے ہیں :۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیف مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں، پھر اس ترکیب خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا، علمی اصطلاح میں اس صورت حال کو علیٰ سبیل التوالی والتعاقب کہیے، اس طرح

---

[1] غبار خاطر ۔ صفحہ ۱۸۲ ۔

اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ
کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور
سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے، مقدار کے حُسنِ تناسب کا انضباط
ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان آخری جرعے سے خالی ہوا، ادھر تمباکوئے
آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خطِ کشیدن تک پہنچ کر دم لیا۔"[1]

اور اس طرح ان اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا وہ ایک
معتدل مزاج ترکیب پذیر کرتے ہیں، یہ حکایت بادہ و تریاک زندگی کی
غلطیوں میں شامل ہو تو ہو، مگر مولانا کے اس مزاج کو کیا کیجیے جو اس پر
مطمئن نہ ہو سکا کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے، اس روزگار
خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی
چاہئیں، مولانا لکھتے ہیں :-

"غور کیجیے وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی
تر نہ کر سکے، وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو۔"[2]

مگر یہ اسی کو زیب دیتا ہے جو ترک و اختیار دونوں پر قدرت رکھتا ہو،
آلودگیاں دامن تر کریں مگر دامن نہ پکڑ سکیں، فرماتے ہیں :-

"اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا، دامن گیر
ہونا مخل ہوتا ہے، کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا
دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے، بھیگتا ہے تو بھیگنے
دیجیے، لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور رہنی

۱؎ غبار خاطر - صفحہ ۸۰ ۲؎ غبار خاطر - صفحہ ۱۴۲ -

چاہیے کہ جب چاہا اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی نہ رہی..... یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے، نہ تو تر دامنی کی گرانی محسوس کیجئے اور نہ خشک دامنی کی سبک سیری نہ آلودہ دامنی پر پریشاں حالی ہو، نہ پاک دامنی پر سرگرانی[۵۲]

مولانا کی طبیعت کا خام مواد عشق و جنوں کی شورشوں سے ڈھالا گیا تھا، جسے انھوں نے بے پناہ قوت ارادی کے ذریعہ عشق مقاصد میں تبدیل کر لیا تھا چنانچہ ہر وہ منظر جو شورشوں اور شدتوں کا پروردہ ہو، ان کے لئے سامانِ راحت بن جاتا ہے، موسم کا اعتدال انھیں پسند نہیں، ان کے تخیل عیش کا سب سے بڑا سرمایہ جاڑے کا موسم ہے، اور اس میں سردی کی جس قدر زیادتی ہو، موسم کا حسن اور زندگی کا عیش ہے، اس کی کمی نقص و فتور کا حکم رکھتی ہے، ان کی طبع سراسیمہ بے چینی سے جاڑے کا انتظار کرتی ہے اور جاڑا بھی کیسا؟ وہ لکھتے ہیں:-

"جاڑے کا موسم ہو، اور جاڑا بھی قریب قریب درجہ انجماد کا رات کا وقت ہو۔ آتش دان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے یا لکھنے میں مشغول ہوں[۵۳]"

ان کے تصوّر میں آتش دان کی موجودگی اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اس کے تصوّر میں گرمی ہے، یہ گرمی بجلی کے ہیٹر سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے مگر اس سے ان کی تسکین نہیں ہوتی، دراصل انھیں شعلوں کا منظر چاہیے، جب تک شعلے

---

۵۲ غبار خاطر - صفحہ ۲۰۴ ۔ ۵۳ غبار خاطر - صفحہ ۱۹۱

بھڑکتے نظر نہ آئیں، ان کے دل کی پیاس نہیں بجھتی، ایک طرف دریائے ہم عنانی کا یہ ذوق و شوق دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی، اس خواہش میں ذائقے کی جو انتہا پسندی ہے وہ جنونِ عشق کی شورش کے اندر سے بھڑک اٹھی ہے، وہ اپنی زندگی کا وہ جاڑا نہیں بھول پاتے جو موصل میں بسر ہوا تھا۔ برف باری کے بعد، آرمینیا کے پہاڑوں کی سرد ہوائیں، کشادہ آتش دان، محراب میں زنجیر سے لٹکتی ہوئی کیتلی، ہر وقت جوش کھاتا ہوا قہوہ کے لئے پانی، یہ تمام مناظر مدتیں گذرنے کے بعد بھی ان کے ذہن میں واضح رہتے ہیں، یہ شوخ اور گہرے رنگ کے پھول، یہ سب عشق بے کنار کا اسی آتشِ بے باک کے اندر سے اُٹھے ہیں جن کو بقول ڈاکٹر عبداللہ ان کی عالی فطرت نے گل و گلزار بنالیا ہے بالکل یہی حال موسیقی کے ذوق کا بھی ہے، یہ طبیعت کے توازن اور فکر کی لطافت میں ممد و معاون ہوتی ہے ان کی حسن آشنا طبیعت ہر جگہ حسن و رنگینی کے چشمے تلاش کر لیتی ہے حُسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل ہو یا نشاط باغ میں حُسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے اور مولانا حُسن کے اس فطری مطالبہ پر ہر جگہ لبیک کہتے ہیں، وہ بہت ہی رندانہ انداز میں ہم کو بتلاتے ہیں:-

"میں آپ سے ایک بات کہوں، میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے، میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا، آوازِ خوش میرے لئے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔۔۔۔ مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو صرف اس

ایک چیز سے محروم کر دیجیے" آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا[1]"
وہ ناسازگار ماحول میں گھریلو پابندیوں کے باوجود بھی چوری چھپے موسیقی کے اس شغل کو جاری رکھتے ہیں، ہدایہ اور مشکوٰۃ کے پڑھنے والوں کے مجمع سے نکل کر یہ پیرزادہ سارا گاما کی سبق آموزیوں کے لئے مسیتا خاں کے ہمراہ ایک رازدار کے گھر جاتا ہے، شیخ احمد سلامہ حجازی سے رسم و راہ پیدا کرتا ہے ایک آفت ہوش و ایمان مغنیہ طاہرہ سے ربط و ضبط بڑھاتا ہے، ام کلثوم کے ریکارڈ سنتا ہے، جیل کی چہار دیواری میں ریڈیو پر ایک مغنیہ خوش لہجہ کی صدائے درد انگیز سن کر کتاب زندگی کے تمام پچھلے اوراق الٹ ڈالتا ہے تصورات کے دریچوں پر چراغاں ہو جاتا ہے، گذرگاہِ خیال جگمگانے لگتی ہے اور ماضی کے گرد و غبار میں لپٹی ہوئی اپریل کی ڈھلتی ہوئی چاندنی رات میں تاج محل کا ایک منظر اس کے پردۂ ذہن پر تھرکنے لگتا ہے :-

"رات کا سناٹا، تاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں، بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں، نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حروف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے ہیں، آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے

---

[1] غبار خاطر - صفحہ ۲۷۰ -

اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے ۔

زخم بر تارِ رگِ جاں می زنم　　　کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی، گویا کان لگا کر خاموشی سے سُن رہی ہے، پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا، چاند بڑھنے لگتا، یہاں تک کہ سر پر آکر کھڑا ہوتا، ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آآکر جھومنے لگتیں، رات کے سیاہ پردوں کے اندر عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سُنائی دینے لگتیں، بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اُٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے[1]۔"

طلسمات کی یہ دنیا فریبِ تخیل کی یہ جادو نگری، ساز و مضراب کا یہ جزیرہ، مولانا کی اسی تخیلی فطرت کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا ہے جس پر مولانا کی اپنی عاشقانہ سیرت اور طبع آشفتگی دوست کی پرچھائیاں پڑی ہیں، موسیقی اور شاعری، ان دونوں سے مولانا کی دلچسپی، ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں اور ایک ہی نفسیاتی پسِ منظر میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، نغمہ بھی ایک شعر ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اسے

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۲۷۱۔

حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا، اس نے اپنی روح معنی کے لئے نواؤں کا بھیس تیار کر لیا، اگر یہ نوائیں شعر کا جامہ پہن لیں تو کبھی حافظ کا ترانہ بن جائیں، کبھی خیام کا زمزمہ، کبھی شبلی کی ماتم سرائیاں ہو جائیں، کبھی ڈرد ویں در تھ کی حقیقت سرائیاں، حقیقت یہ ہے کہ ابوالکلام نے حقائق کو اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے علاوہ تصوف اور فلسفہ دونوں کے وسیلوں سے پایا تھا، اور ان کی فکر میں تصوف اور فلسفہ دونوں کا ایک وجدانی مرکب تیار ہو گیا تھا، اور ایک منضبط قلندری کی شان ان کی طبیعت میں پیدا ہو گئی تھی، قلندری کی صہبائے آبگینہ گداز جب الفاظ اور جملوں کے پیکر میں ڈھلتی ہے تو ان کا قلم کیف و سرور میں ڈوب جاتا ہے، نوک قلم سے ایک سیل سارواں ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات بقول عبد المغنی" اپنے عروج پر صاحب قلم کا روحانی اہتزاز اس نقطے پر پہونچ جاتا ہے جہاں پوری فضا مرتعش نظر آنے لگتی ہے، وجد و حال کی ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس میں فقرے ناچتے اور گنگناتے محسوس ہوتے ہیں[1]۔"

اشعار کا استعمال نثر میں موقع اور محل کے اعتبار سے اشعار کا استعمال بہت سے مصنفین کا ہر دور میں شیوہ رہا ہے اور انھوں نے نفس موضوع میں جان ڈالنے کے لئے اور تاثر کو شدید بنانے کے لئے اشعار کے حربہ سے کام لیا ہے، لیکن یہ فن ابوالکلام کے ہاتھ میں آکر اپنی معراج کو پہونچ جاتا ہے، فارسی اور عربی شعر و ادب پر مولانا کو جو غیر معمولی عبور حاصل تھا، اور ان کا یہ ذوق ان کے مزاج اور فکر میں

---

[1] عبد المغنی، نقطۂ نظر۔ کتاب منزل پٹنہ طبع اول۔ صفحہ ۳۹۴۔

جس طرح رچ بس گیا تھا، وہ مولانا کے قلم سے جب اُردو نثر میں منتقل ہوتا ہے تو اس کی چھوٹ سے ان کی نثر کا پیمانہ بھی جگمگانے لگتا ہے ان کا روحانی دفورا ور دل کا گداز اپنے اظہار و تعبیر کے لئے شعر کا سہارا لیتا ہے، وہ کبھی شعر لکھتے ہیں اور کبھی شعر کی معنی آفرینی سے کام لیتے ہیں اور کبھی کبھی اشعار میں استعمال کئے ہوئے استعاروں اور تشبیہوں سے بھی کام لیتے ہیں انھوں نے اشعار کے انتخاب اور استعمال میں جس سلیقے اور جس جمالیاتی ذوق کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال اردو نثر میں خال خال ہی نظر آتی ہے، اشعار ان کے حافظہ پر اسی طرح ثبت تھے جس طرح محاورے عام اہلِ قلم کی نوک زبان پر ہوا کرتے ہیں ان کے خیالات کی تائید و تشریح کے لئے روانیٔ تحریر میں اشعار بے اختیار ان کے قلم سے ٹپک پڑتے تھے، خوش آہنگ اور معنی آفریں مصرعے، ان کے تخیل اور تفکر کو اپنے رنگ و آہنگ سے اور بھی زیادہ نغمہ ریز بناتے ہیں، یہ آرٹ ان کا اپنا آرٹ ہے، ان کو لڑکپن ہی کے زمانے سے شاعری کے ساتھ ایک فطری لگاؤ رہا، اور یہ ذوق کسی نہ کسی انداز میں آخری عمر تک ان کے ساتھ رہا، نظیری، عرفی، بیدل، غنی کشمیری، فیضی، میر، غالب اور مومن کے اشعار کو اپنی نثر میں جگہ دینے کے ساتھ ساتھ مولانا نے ان شعرا کے اشعار کو بھی اپنے نثر کے ساتھ زندہ جاوید بنا یا جو یا تو گم نام تھے یا لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب مبذول نہ کرا سکے تھے، ان کے اندر شعر فہمی کا وہ ملکہ تھا جو شعرا کو بھی کم نصیب ہوتا ہے، خصوصیت کے ساتھ ایسے اشعار پر ان کی نگاہیں پڑتی تھیں جن میں تفکر و وجدان، جذبات و جمالیات کا خوش گوار امتزاج ملتا ہو۔ نثر میں اشعار کا یہ استعمال دراصل لسانی توسیع اور ارتقا کا عمل ہے، اور

اس کے معقول استعمال سے زبان کی قوت نمو اور بالیدگی میں اضافہ ہوتا ہے، اشعار اور مصرعوں سے کشید کیا ہوا مولانا کا یہ اسلوب ایک زلال مقطر ہے، جس میں وجدانی لذتوں کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو شاعری کی سرور آمیز چاشنی بھی شامل ہے، مجرد افکار کو مجسّم بنا دینے کا رجحان اور عقیدے کی محکمی، عربی ذہن کی خصوصیت ہے جو ابوالکلام کو موروثی طور پر ملی تھی، اسی طرح تخیئلی لطافتوں سے وہ دل جیسی جو فارسی شاعری سے انتہا درجہ کے شغف کی صورت میں ان کی تحریروں میں نمودار ہوئی، وہ دورِ مغلیہ کی تہذیبی اقدار کا ورثہ تھا جس کے عناصر بھی ابوالکلام کے مزاج کی تشکیل میں کام آئے تھے، اشعار کے اس قدر زیادہ استعمال کی بنا پر کچھ لوگوں کا یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ مولانا کی تحریروں میں شعر کے پہلے کی نثر گویا شعر ہی کی تمہید و تشریح ہوا کرتی تھی درست نہیں ہے مولانا کی منفرد علمی اور ادبی شخصیت کا ایک پہلو شعراء کا مطالعہ اور ان کی بے پناہ قوتِ حافظہ بھی تھی، چند برسوں کی بات تو درکنار تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش ان کے ذہن میں اس طرح اُبھر آتے تھے، گویا ابھی کتاب دیکھ کر اُٹھے ہیں، ان کو مضمون کے ساتھ کتاب، کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور پھر یہ بھی یاد آجاتا تھا کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا یا آخری سطروں میں، اشعار کا تو ذکر ہی کیا ہے، نثر کے طویل اقتباسات بھی اُن کے ذہن میں محفوظ رہ جاتے تھے، ایک خط میں غلام رسول مہر کو لکھتے ہیں:۔

"دولت خاں لودی کا مقولہ محض حافظہ سے لکھا ہے لیکن اس میں "فتح آسمانی" ہی ہے،....... اگرچہ دماغ مطمئن تھا، خیال ہوا برسوں کی بات ہے، اصل مقام نکال کر دیکھ لوں،

چنانچہ "ماثر الامراء" میں مقام مل گیا' اور دولت خاں لودی کا مقولہ ٹھیک وہی نکلا' جو حافظہ میں محفوظ رہ گیا تھا طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس مقولے کی پوری محافظت کی تھی اور ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا تھا۔[1]

ظاہر ہے کہ جو شخص اس قدر غیر معمولی قوت حافظہ کا مالک ہوگا' نہ تو اس کی نکتہ وری اشعار سے ماخوذ و مستعار ہوگی' اور نہ اس کی نثر اشعار کی تفسیر و تشریح کی مرہون منت' حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کی تائید و تشریح موقع و محل کی مناسبت کے اعتبار سے سیاق و سباق سے مربوط اشعار کے ذریعہ وقت ضرورت پر کرتے ہیں اور اشعار کا یہ ذخیرہ بغیر کسی آورد کا اور کاوش کے حسب ضرورت وقت پر ان کے سامنے دست بستہ کھڑا رہتا ہے' اور وہ بہ مقتضائے تخیل ان اشعار کے ذریعہ اپنی نثر کو منقش بناتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں' اجمل خاں کا یہ خیال کہ مولانا لکھنے سے پہلے بہت سے اشعار مستحضر کر لیتے تھے اور انھیں مضمونوں میں اس طرح سموتے تھے کہ شاعر سنتا تو خود حیران رہ جاتا کہ شعر کس قدر بلند لطیف اور سلیس ہوگیا۔[2] جزوی طور پر صحیح ہے' اس رائے کے ابتدائی حصّہ میں اشعار کو مستحضر کرنے کی جو بات کہی گئی ہے' اگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ مولانا اپنے ذہن میں خامہ فرسائی کرنے کے پہلے موضوع زیر بحث سے متعلق اشعار کی ایک فہرست بنا لیتے تھے' تو صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ مولانا نے جس

---

[1] بحوالہ آجکل۔ صفحہ ۷۶ آزاد نمبر [2] اُردو ادب آزاد نمبر۔ صفحہ ۳۱۔

بے ساختہ انداز میں اور جن جن زاویوں سے اشعار کا استعمال کیا ہے وہ پہلے سے مرتب کیے ہوئے نظام تحریر کی غمازی نہیں کرتا، غبار خاطر میں مستقل عنوانات پر بحث ضرور کی گئی ہے مگر جن اشعار کا استعمال ہوا ہے اور جن جن مقامات پر اشعار کی پیوند کاری کی گئی ہے وہ زیادہ تر گریز کے مقامات ہیں ایسے گریز کے مقامات جن کو اگر موضوع زیر بحث سے الگ کر دیا جائے تو نفس موضوع پر کوئی خراش نہیں پڑتی، البتہ اسلوب زخمی ہو جاتا ہے اور تاثر کی شدت میں کمی آجاتی ہے، اسی طرح ترجمان القرآن میں مولانا کا اشعار استعمال نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے سے اشعار کے مستحضر کرنے کی بات درست نہیں، خود غبار خاطر کے ان خطوط میں جن کے اندر علمی تاریخی یا مذہبی مسائل پر بحث کی گئی ہے اشعار کا استعمال نسبتاً کم یا بالکل نہیں ہوا ہے، واقعہ یہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے مولانا اپنی نثر کا اسلوب کبھی سادہ یا رنگین، سلیس یا بلیغ بناتے تھے اور جہاں پر جس طرح کی ضرورت پیش آتی تھی اسی طرح کے وسیلے استعمال کرتے تھے، یہی وسائل ان کی نثر کو آراستہ کر کے دل کش بناتے ہیں، اور ان کے شعور کی رنگینی، ان کے تکلم کو بھی نغمہ ریز بناتی ہے، کثرت کے باوجود ان اشعار کی برجستگی اور موقع ومحل کے اعتبار سے موزونیت حیرت انگیز ہے، یہ سلیقۂ سخن، یہ گلفشانیٔ گفتار ابوالکلام کے منفرد اسلوب کی ایک خصوصیت ہے، جسے اس اعتماد کے ساتھ انھیں جیسا دانائے راز برت سکتا تھا۔

غبار خاطر کا اسلوب عام طور پر یہ رائے دی گئی ہے کہ غبار خاطر مولانا کی تصانیف میں اوّل درجے کی تصنیف نہیں ہے، اور اس میں ان کا قلم بیمار اور ضعیف معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر سید عبداللہ

نے لکھا ہے:۔

"غبارِ خاطر تو اس ضعف و پیری کی یادگار ہے جس میں انسان اپنے خول سے باہر نکل کر انحطاطِ وجود کا علاج محض اظہار و نمائش سے کیا کرتا ہے، نمودِ ہستی کی خواہش اس وقت بیدار ہوتی ہے جب انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب اپنے متعلق مجھے خود بھی کچھ کہنا چاہئے[۱]"

اسی طرح ایک دوسری رائے اسلوب احمد انصاری نے بھی دی ہے، وہ کہتے ہیں:۔

"غبارِ خاطر کے خطوط..... میں بے ساختگی، عصری ہمدردی اور زندگی کے سخت و شکست کو ہموار کر کے دل آویزی پیدا کرنے کا فقدان ہے، ان میں اچھی نثر کی خوبیاں نہیں ہیں، ابوالکلام آزاد یا تو مقدمات کبریٰ و صغریٰ قائم کرتے ہیں یا فارسی اور عربی آمیز الفاظ اور اشعار سے ان کا تخیل اس درجہ آتش گیر ہو جاتا ہے کہ عبارت توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور اسلوب بیان سکون یافتہ نہیں رہتا اور وہ اپنی خطابت اور طلاقت لسانی کے رحم و کرم پر نظر آتے ہیں اس طرح یہ خطوط نثری شاعری کی مایوس کن مثال بن گئے ہیں[۲]"

اس طرح کی غلط فہمیاں عموماً اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب لوگ غبارِ خاطر کا تقابلی موازنہ تذکرہ اور الہلال کی تحریروں سے کر دیتے ہیں اور اس میں بھی اسی تند و تیز طرزِ تحریر کی تلاش کرتے ہیں جو پہاڑوں کی جیرتی کاٹتی موج در موج سمندر میں گرتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مولانا کے یہاں انشار پردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب

---

[۱] ماحول آزاد نمبر ۱۹۵۹ء [۲] اردو ادب آزاد نمبر۔ صفحہ ۱۰۱ ۔ ۱۰۰ ۔

ملتے ہیں، اور ان کا اسلوب تحریر موضوع کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اگر ہم ترتیب و تاریخ وار ان کی تحریروں کو پڑھیں تو ہم اس نتیجہ پہونچتے ہیں کہ ان کے انداز و اسلوب کا بڑا ہموار ارتقا ہوا ہے، ان کی شاندار اور پُر اثر و پُر شکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی لیکن غبار خاطر اور کاروان خیال کا اسلوب دوسرے موثرات خارجی کا نتیجہ ہے، اسی لئے اس میں ادب کی گل کاریاں ہیں، تذکرہ میں ان کی طبیعت کا وہ نقشہ ہے جو انھیں موروثی طور پر ابتدائی ماحول سے ملا، لیکن غبار خاطر میں وہ رنگ ہے جو اکتساب اور ریاضت کے ذریعہ دن بدن نکھرتا اور سنورتا رہا ہے، الہلال میں بقول رشید احمد صدیقی "دعوت دار و رسن ہے تذکرے میں "دید و شنید" غبار خاطر میں دعوت "نوش و نشید" تفسیر قرآن کا لب و لہجہ عالمانہ ہے۔" یہ کوئی کلیہ نہیں بنایا جاسکتا کہ نمود ہستی کی خواہش اسی وقت بیدار ہوتی ہے جب انسان انحطاط وجود میں مبتلا ہوتا ہے اور یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب اپنے متعلق بھی اسے کچھ کہنا چاہیے، بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی انا کا سرجوش کسی طرح نہیں دبا سکتے، اور ان کے "میں" بولنے میں قصد، بناوٹ اور نمائش کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ خیال غلط ہے کہ "اظہار و نمائش" اور نمود ہستی کی یہ خواہش مولانا ابو الکلام کی تحریروں میں اس وقت پیدا ہوئی جب وہ ضعف و پیری کا شکار رہتے ان کی فکری انفرادیت زندگی کے ہر دور میں سایے کی طرح ان کے پیچھے لگی رہی اور انھوں نے ہر دور میں اپنے وجود کا اظہار اور اس کی نمائش بڑے آن بان اور طمطراق کے ساتھ کی یہ دوسری بات ہو کہ غبار خاطر میں وہ زیادہ کھل کر اپنے کو ہمارے سامنے لائے ہیں مگر اس اظہار کے پیچھے جو کسی قدر بے محابا تھا ضعف و پیری سے زیادہ دوسرے عوامل کارفرما تھے، الہلال کا ابو الکلام بھی اپنی انفرادیت کا قدیمی سرجوش دبا نہیں پاتا، اور اپنے وجود کے اظہار میں سر تا پا صدائے ربانی بن کر خوابیدہ قوم

کو بیداری کے تازیانے مارتا ہے، اسے اپنے علم و فضل، سوجھ بوجھ اور تعقل و تفکر پر پورا اعتماد رہتا ہے۔ تذکرہ کے اندر بھی وہ اپنی تیغ جوہر دار کے ساتھ ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے سلسلۂ علم و ارشاد، حق گوئی اور حق پرستی کی رجز خوانی کرتا ہے، اور جب خود اپنے متعلق خامہ فرسائی کرتا ہے تو دبانے کے باوجود اس کی انفرادیت اور بھی زیادہ اُچھلنے لگتی ہے، وہ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پاتا ہے، پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھتا ہے، وہ لکھتا ہے :-

"پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاک پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بار بار اُترنا پڑا کہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی ہی مرتبہ اُچھلنا پڑا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ لغزش نہ ہو جائے، سورج چراغاں لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے، سب نے نقاب اتار دئے، سارے پردے چھلنی ہو گئے، سب کے ابروؤں میں اشارے تھے سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لئے دراز تھے یا دل کو پکڑا تو ساز ہستی کا طنبورہ نکلا بجلی کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا تبسم آشکارا نکلا، ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آ گئے، مگر پھر بھی خالی رہیں، سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا رات معدوم تھی، ظلمت کی بڑی ڈھونڈھ ہوئی مگر نہ ملی، خواب و غفلت کا لاکھ پتہ پوچھا مگر کسی نے نہ بتلایا جب کبھی آنکھیں بند کیں تماشے دیکھے، جب کبھی کان بند ہوئے صداؤں اور نواؤں سے بھر گئے، سورج

نے کہا دو لاکھ میل دور ہوں، قطب شمالی سے روشنی اُتری اور بولی، ایک سکنڈ میں ایک لاکھ نوے ہزار میل طے کرتی ہوں مگر آنکھوں نے کہا یہ تو تارِ نگاہ کی پہلی منزل ہے ...... عالم آفاق وانفس میں جو کچھ ہے، ان میں سے کوئی نہ تھا، جس کی ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو، سب کی زبانیں گویا سب کے اشارے آشکارا، سب کی سطریں اُبھری ہوئی تھیں، نہ کوئی لب بند رہا۔ نہ کوئی جلوہ مستور ہے۔"

اس طرح اس زمانے میں بھی جب مولانا ترجمان القرآن لکھ رہے تھے، اپنے علم وفضل اور اکتسابات کے اظہار و نمائش سے باز نہ رہ سکے اور انھوں نے لکھا:

"کامل ستائیس برس قرآن میرے شب و روز کا موضوع رہا ہے، اس کی ایک ایک سورۃ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں طے کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں، تفاسیر وکتب کا جتنا مطبوعہ وغیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے، اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔"[1]

صرف یہی نہیں کہ مستقل تصانیف میں مولانا نے اپنے علم وفضل کی نمائش کی ہو

---

[1] مقدمہ ترجمان القرآن۔ صفحہ ۴۷۔

بلکہ ان کی فطری انا نے ان خطوط اور مکاتیب میں بھی اپنے اظہار کے راستے بنائے ہیں جو انھوں نے زندگی کے مختلف ادوار میں اپنے احباب کو لکھے ہیں،
۲۳ ستمبر ۳۷ء کو انھوں نے غلام رسول مہر کو ایک خط میں لکھا:۔

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا، غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا، نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی، بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے، مذہب، علوم و فنون، ادب، انشا و شاعری کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں، اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامنِ دل مالا مال نہ ہوا ہو پھر یہ کہ ہر منزل اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سازیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں...... لیکن افسوس جس نے ہاتھ فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا، اس نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا، میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالے کر دیا گیا"[1]

اسی طرح ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"اگر پیام اجل سر پر آ پہونچا...... تو آہ کس سے کہیے اور کون جانتا ہے کہ اس مشت خاک کے ساتھ ساتھ کیا کیا چیزیں ہیں جو سپرد خاک ہوں گی فیضان الٰہی نے اپنے فضل مخصوص سے

---

[1] نقش آزاد۔ صفحہ ۱۵۸۔ ۱۵۷۔

علوم و معارف کے کیسے کیسے دروازے اس عاجز پر کھولے ہیں
جو بند کے بند رہ جائیں گے[1]
ان اقتباسات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا کی انا انا کی زندگی کے ہر مرحلے میں ان کے ساتھ رہی، اور اس کا اظہار ان کی ابتدائی تصانیف میں بھی ہوا، چنانچہ غبار خاطر میں بھی یہی چیز اپنے فطری انداز میں آئی، اپنی شخصیت کی نمائش، اور نمود ہستی کی یہ خواہش انحطاط وجود کا علاج نہ تھا، بلکہ مولانا کا انفرادی اور مخصوص طرۂ امتیاز تھا جو صرف ضعف و پیری کے زمانہ میں نمودار نہ ہوا بلکہ شروع سے آخر تک ہر زمانے میں ان کے ساتھ رہا، اسی طرح اسلوب احمد انصاری کی بھی یہ رائے کہ غبار خاطر میں اچھی نثر کی خوبیاں موجود نہیں ہیں اور یہ نثری شاعری کی مایوس کن مثال ہے، اپنی جگہ پر درست نہیں ہے، فارسی اور عربی آمیز الفاظ اور اشعار سے تخیل کو آتش گیر کر کے قارئین کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لینا ادب کا کوئی اتنا بڑا سانحہ نہیں ہے کہ ہم غبار خاطر کے محاسن کو نظر انداز کر کے اس کو نثری شاعری کی مایوس کن مثال قرار دے دیں۔ اس طرح کی تنقید کرتے وقت دراصل ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بنیادی طور پر غبار خاطر انشائیہ ہے اور اس کو اسی معیار پر جانچنا مناسب ہے جس معیار پر انشائیہ جانچا جاتا ہے، انشائیہ میں سب سے زیادہ ضروری چیز مضمون نگار کا شخصی انداز ہے، یہاں مصنف کا کام معلومات فراہم کرنا یا پیدائش و اموات کا رجسٹر مرتب کرنا نہیں ہے، وہ ہر ہر لفظ اور ہر ہر جملے پر اپنی شخصیت کی مہر لگاتا ہے، انشائیہ کی محفل ایک بزم بے تکلف ہوتی ہے

---

[1] الجمعیۃ آزاد نمبر۔

جہاں انسان اپنے دل کی بات مزے لے کر بیان کرتا ہے اس کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی، یہاں اسے مکمل آزادی ہوتی ہے کہ جس موضوع پر چاہے کھل کر بات چیت کرے، مگر شرط یہ ہے کہ ہر موضوع کے باب میں اس کی اپنی شخصیت کی پرچھائیاں حل ہو گئی ہوں، یہاں ادب کے میکانکی عمل سے ہٹ کر زندگی کا مطالعہ نظر آتا ہے اور اس کام میں لکھنے والے کی اپنی داخلی کیفیت رہ نما بن جاتی ہے، یہ مجموعی طور پر ایک ہلکی پھلکی صنف ہے، اور اظہار جذبات کا بہترین آلہ ہے اور ہم کو چند لمحات کے لئے دنیاوی تفکر سے نجات دلا کر اپنی جمالیاتی موجوں میں گم کر دیتی ہے، شاعری کی طرح اس کا لب و لہجہ بھی نرم و نازک ہوتا ہے، یہاں بے ربطی اور بے ترتیبی ربط بن جاتی ہے، اس کی اصلی روح غیر رسمی انداز بیان ہے۔ یہاں مصنف اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر اپنے دیگر تجربات بھی بیان کر سکتا ہے، یہ ایک ذاتی تصویر ہوتی ہے جس پر مصنف کی اپنی چھاپ پڑی ہوتی ہے، اس کا مقصد انبساطی اور نشاطی ہے، یہ ایک سرور اور وجدان کی سی کیفیت قارئین پر طاری کرتا ہے، یہ نشاط اور انبساط موضوع کے انتخاب اور انشاء پردازی کی شگفتگی اور رنگین بیانی دونوں طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اس معیار پر ابوالکلام کے انشائیوں کو جانچتے ہیں جو غبار خاطر میں شامل ہیں تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کی شخصیت جلوہ گر ہے، اس نے چڑیا چڑے کی کہانی لکھی ہے، حکایت زاغ و بلبل ترتیب دی ہے، داستانِ بے ستون و کوہ کن کا سر و سامان کیا ہے، چائے نوشی کے تذکرے چھیڑے ہیں، لالہ و گل کی فریب کاریوں کے پردے اٹھائے ہیں اور حکایت بادہ و

تریاک سے اپنا جی بہلایا ہے مگر ان تمام پردہ ہائے مجاز میں اس کی اپنی شخصیت جلوہ گر ہے، اور ہر جگہ اس کے گل ریز اور گوہر بار قلم نے رنگ و بو کے دلکش اور روح پرور لالہ زار کھلائے ہیں۔

کاروانِ خیال کاروانِ خیال، مولانا آزاد اور نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو دونوں احباب کے درمیان ۴ ستمبر ۱۹۲۰ء سے ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء تک جاری رہے۔ اس مجموعہ میں کل ستائیس خطوط شامل ہیں، جن میں سترہ مولانا آزاد کے اور دس مولانا شیروانی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں، ابتدا میں ستاون صفحات کا ایک مقدمہ محمد عبدالشاہد خاں شیروانی اور اسسٹنٹ لائبریرین لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا لکھا ہوا شامل ہے جس میں دونوں اصحاب کے محاسن و فضائل کا تذکرہ عقیدت مندانہ اور نیاز مندانہ انداز میں کیا گیا ہے، اور ان کی طرزِ تحریر کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، ایک سو اکیاون صفحات کا مجموعہ مولوی محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور نے ۱۹۴۲ء کے اواخر میں شایع کیا۔

"کاروانِ خیال" کے خطوط بڑی حد تک غبارِ خاطر کے خطوط کے مماثل نظر آتے ہیں اس کتاب میں کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جسے غبارِ خاطر میں دُہرایا نہ گیا ہو، نغمہ و موسیقی سے مولانا کی دلچسپی، چائے کا ذکر، صبح خیزی...... غرض کہ وہی تمام موضوعات جن کا ذکر تفصیل کے ساتھ "غبارِ خاطر" میں ہوا ہے، اجمالاً یہاں بھی موجود ہیں البتہ شروع کے دو ایک خطوں سے کچھ تاریخوں کا مبہم تعین ہو جاتا ہے ایک خط میں بغداد کے سفر کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے، اسی طرح ایک دوسرے خط میں شبلی کے شعر و ادب کے بارے میں

مولانا کی رائے معلوم ہو جاتی ہے، اسلوب کے اعتبار سے فرق صرف اس قدر ہے کہ "کاروانِ خیال" میں مصنف کا شخصی انداز زیادہ نمایاں ہے اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان خطوط کی تخلیق میں قصد اور ارادہ کا اتنا زیادہ دخل نہیں ہے، جتنا "غبارِ خاطر" میں موجود ہے اس میں بھی یادوں کی بزم سجائی گئی ہے، اور مصنف نے ماضی کے نہاں خانوں میں جھانک کر دیکھا ہے، مگر ماضی کے ان رنگین دھندلکوں کی سیر مکتوب نگار نے تنہا نہیں کی ہے بلکہ ہر جگہ وہ مکتوب الیہ کو ساتھ لئے پھرا ہے، اس میں خط لکھنے والے اور خط پڑھنے والے دونوں کے درمیان مخاطبت کے رشتے مضبوطی کے ساتھ منسلک نظر آتے ہیں، مصنف افکارِ زمانہ اور کاوش ہائے دنیا دونوں سے الگ ہو کر بیٹھنا ضرور چاہتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ مکتوب الیہ کی معیت میں بیٹھے اور پچھلی صحبتوں کی یاد کو تازہ کرے، اس بزم میں وہ تنہا اپنی ذات میں گھرا ہوا نہیں ہے، اسے وہ تمام ہم نفس یاد آتے ہیں جو ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، وہ صحبتیں یاد آتی ہیں جو خواب و خیال ہو گئیں، اسے مکتوب الیہ کے ساتھ ساتھ اس کے تمام مصاحب و متعلقین بھی یاد آتے ہیں۔

"معلوم نہیں ملّا صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کا کیا حال ہے، ان کا "کونین" کو "کو نین" بروزن "زوجین" کہنا اس وقت بھی دماغ میں گونج رہا ہے، آپ کو موقع یاد آیا؟ جلسۂ ندوہ کے موقع پر جب مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، اور مجھے بخار آیا تھا، میں نے کونین کی مقدار بڑھانی شروع کی اور ملّا صاحب نے اس کے مثالب و قبائح پر مسلسل

لیکچر دینا شروع کر دیا افسوس ان صحبتوں کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ غبار خاطر کی طرح یہاں بھی ساری درازنفسی محض اس لئے ہے کہ مولانا کسی ہم نفس سے باتیں کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ ملاقات کے مواقع فراہم نہیں ہو پاتے اس لئے نصف ملاقات پر اکتفا کرتے ہیں شوق ملاقات کی سوزش ان کے دل میں اشتعال پیدا کرتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ خط کی جگہ ہم نشینی و ہم زبانی کا موقع نکلتا تاکہ گزری ہوئی محفلوں کی یاد میں اپنی سوگواریوں کی ایک نئی محفل غم برپا کر سکتے، مگر چونکہ زندگی کے دوسرے علائق خصوصیت کے ساتھ سیاسی مصروفیات دامن گیر ہوتی ہیں اس لئے نصف ملاقات کا یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، مگر یاد رفتگاں کا یہ جوش و خروش رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے اور ابتدائی چند خطوط کے بعد آخر کے خطوط کی نوعیت رسیدی رقعات کی ہو کر رہ جاتی ہے۔

"کاروانِ خیال" میں ۲۹ ستمبر اور ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء کے خطوط اس معنی میں اہم ضرور ہیں کہ ان سے مولانا کا سوانح نگار کسی حد تک فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور ان سے ایک مخصوص زمانہ میں مولانا کے اشتغال پر کسی حد تک روشنی پڑتی ہے، بغداد کی شب ماہ میں عین دجلہ کی لہروں میں اس بزم انس کا تذکرہ جسے مرزا محمد کاظم رشتی نے ترتیب دیا تھا ان تمام اصحاب فضل و کمال کی یاد کی تمہید بن جاتا ہے جن سے اس زمانہ میں مولانا متاثر ہوئے۔ محمود شکری، آلوسی زادہ، شیخ ابو حمزہ کردی، سید عبدالرحمن نقیب، سید فضل اللہ اصفہانی، جمیل صدقی الزہاوی سید صدرالدین عاملی،

سید محمد کاظم طباطبائی، اخوند ملا محمد کاظم خراسانی، مرزا محمد حسین دانش جیسے افراد جو اپنی اپنی خصوصیات میں فرد تھے، اور جن سے مولانا متعلق رہے ان سب کا ذکر اس خط میں ہوا ہے، بیتے ہوئے دنوں کی یاد کے ساتھ ساتھ موسیقی کے ذوق نے بھی اس خط میں ان کے قلم سے وہی گل کاریاں کرائی ہیں، جن سے ہم غبار خاطر میں لطف اندوز ہو چکے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"کبھی شب میں چند لمحے فرصت کے میسّر آجاتے ہیں، تو ریڈیو میں طہران کی مجلس ساز کے چند آہنگ سن لیتا ہوں کہ کامل معنوں میں سرود ہمسایہ کے حکم میں داخل ہیں، کل رات کو نو بجے طبیعت بہت بے کیف ہو رہی تھی، کاغذات کے انبار کو اپنی طبیعت کی طرح پریشان و منتشر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، اور ریڈیو کو چھیڑا تو احمد تبریزی لسان الغیب کی یہ غزل اپنے آہنگ تازہ میں گا رہا تھا۔

نہ لبر مرکیدہ ساغذ نازش قلبے گجاست پیک صبا گوبیا یکن کمرے

وقت کے تضادات کا کرشمہ دیکھیے بعینہٖ یہی غزل آج سے تئیس برس پہلے ایک بزم انس میں سُنی تھی، ..... ہائے کیا زمانہ تھا اور کیا اس عالم رنگ و بو کی جلوہ طرازیاں تھیں، میری عمر بیس اکیس برس کی ہو گی، عہدِ شباب کے ولولوں سے دل کا ایک ایک ریشہ معمور تھا، جس منظر کو دیکھتا تھا، جنت نگاہ تھا، جس نوائے ہستی کو سُنتا تھا فردوس گوش تھی[۱]۔"

۱- کاروانِ خیال۔ صفحہ ۷۱-۷۲-۷۳۔

اسی طرح ۲۶ اکتوبر کے مکتوب میں شیخ حزیں کا ذکر، مولانا کو سماع کی کیفیتوں اور شورش انگیزیوں کے تجربات کی یاد دلاتا ہے، اور وہ اس صحبت سوز و ساز کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں جب آگرہ کے ایک گوشۂ چمن میں امیر خسروؒ کا ایک مطلع ان پر بیخودی و سماع کی کیفیت طاری کر دیتا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

"ناگاہ امیر خسروؒ کا یہ مطلع پردۂ ساز میں بہ ہزار دل کشی و رعنائی زمزمہ پرداز ہوا ؂

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز دردہا دادی و درمانی ہنوز

کیا کہوں اور کیوں کر کہوں کہ بیخودی و سماع کا عالم طاری ہو گیا تھا یہ مطلع بارہا پڑھنے اور سننے میں آ چکا تھا مگر اس وقت ایسا معلوم ہوا گویا زندگی میں پہلی مرتبہ گوش زد ہوا ہے، اور اس کے صاف لفظوں میں جو صاف معانی پوشیدہ ہیں ان کی حقیقت کا پہلی مرتبہ انکشاف ہوا ہے..... روح نے بارہا کالبد خاکی کو خالی کر نا چاہا مگر پھر اٹک کر رہ گئی... باوجودیکہ ایک قرن سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے، مگر جو چولھا ان وقتوں میں گرم ہوا تھا، آج تک ٹھنڈا نہیں ہوا، انگارے بجھ چکے ہیں مگر خاک کریدی جائے تو اب بھی چنگاریاں نکل آئیں گی، اس سے زیادہ آپ کو کیا لکھوں کہ الحمد للہ اس کوچہ کے رسم و راہ سے آشنا اور دولتِ معنوی کی بخششوں سے سرمایہ اندوز رہ چکے ہیں[۱]"

---

[۱] کاروانِ خیال - صفحہ ۸۹ - ۹۰ -

شرعی زاویہ ہائے نظر کے اختلاف کے باوجود ابتدائی ایام میں شعر و نغمہ کا یہی ذوق مولانا کو اپنے والد کے عرس میں شرکت کے لئے بھی مجبور کرتا رہا ہے، چراغ حسن حسرت کی روایت ہے کہ مولانا ہر سال کے سال ان کے والد کا جو عرس ہوتا ہے اس میں شریک ہو جاتے ہیں[1]۔"

اسی خطہ میں شاہ عبد المعالی اور شیخ عبد الحق محدث کے تذکرے سے گذرنا ہوا مولانا کا روئے سخن اس رشتۂ انس کی طرف ہو گیا ہے جو ان کے اور مولانا شبلی کے درمیان قائم تھا، اور مولانا نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ علامہ شبلی کے شعر و ادب کے بارے میں رائے دی ہے، انھوں نے خصوصیت کے ساتھ شبلی کی ان خصوصیات کی نشان دہی کی ہے جو خود ان کے اپنے مزاج کے عین مطابق تھیں، ذوق و فکر کی بلندی، طالبانہ طلب علم کے باوجود خشکی طبع کے مہالک و آفات سے اپنے کو محفوظ اور بچائے رکھنا، شاعری کے ذوق و فہم کا اعلیٰ مرتبہ رکھنا، فارسیت کے ذوقِ اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر و تخیل کے نئے نئے میدانوں میں خامہ فرسائی کرنا، شبلی کی یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کی طرف مولانا نے توجہ فرمائی ہے، اور ان کو ابھارا ہے، اور یہاں تک لکھ دیا ہے:

"غزل میں تو یقیناً مولانا کے یہاں غالب سے کہیں زیادہ سرمستی و کیفیت ہے اور حقائق واردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے[2]۔"

---

[1] ابو الکلام آزاد۔ مرتبہ عبد اللہ بٹ۔ صفحہ ۵۴۔

[2] کاروان خیال۔ صفحہ ۹۵۔

۴ مارچ ۱۹۴۲ء کے خط میں مولانا نے اپنے ذوق چائے نوشی کے ساتھ حسب معمول یاد رفتگاں کی بزم سجائی ہے اور ان زخموں کو کریدا ہے جو استداد زمانہ سے داغ بن کر رہ گئے ہیں ان کو وہ تمام حریفانِ محفل جو کبھی ہم نفس و ہم آہنگ رہا کرتے تھے، یاد آئے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"غم صرف اسی کا نہیں ہے کہ یہ لوگ جدا ہو گئے، غم اس کا ہے کہ وہ دنیا ہی لٹ گئی جس دنیا کی یہ لوگ مخلوق تھے، اب نہ وہ دنیا واپس آسکتی ہے نہ وہ صورتیں اور سیرتیں پیدا ہو سکتی چند پس ماندگان رہ گئے ہیں، جنھیں

نہ تو قافلہ کا سراغ ملتا ہے اور نہ منزل سے آشنا ہو سکتے ہیں

نہ ہمیں کوئی پہچانتا ہے، نہ ہم کسی کے شناسا ہیں ؎

سراغ یک نگاہ آشنا در کس نمی یابم

جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کور می باشد [1]

دنیا کی بھری انجمن میں اپنی تنہائی کا احساس، زندگی کے آخری دور میں مولانا کے یہاں بہت زیادہ ابھر آیا تھا، اور خصوصیت کے ساتھ اس میں شدت اس وقت پیدا ہو گئی تھی جب سیاسی جذب و شوق کے بلبلے ٹوٹنے لگے تھے، یہ ضرور صحیح ہے کہ ان کے ایمان و عزم کی جو صورت ابتدا میں تھی وہ آخر وقت تک ان کے ساتھ ہی ان کے سینہ میں جو انگیٹھی دہک رہی تھی وہ سرد نہ ہوئی لیکن ان کا احساس زخمی تھا اور ان کے دامن کو قوم دست درازیوں سے گلہ تھا، انھوں نے بہت ہی شدید کرب کے احسا

---

[1] کاروان خیال - صفحہ ۱۱۲ -

کے ساتھ جامع مسجد دہلی میں ایک عظیم الشان اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کہا تھا:۔

"تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا، اور تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لئے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی، میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں..... سچ پوچھو اب میں ایک جمود ہوں، یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے[۱]"

ظاہر ہے کہ اس احساس کا آدمی رندانِ خوش اوقات اور یارانِ وفا کو زحمتِ التفات دینے کا کس قدر متمنی ہوگا، اور ان کی یاد اور ان کی معیت میں کس قدر سکون و آرام محسوس کرتا ہوگا،

اس کے بعد جو خطوط کاروان خیال میں شامل ہیں ان کی نوعیت زیادہ تر رسیدی رقعات کی ہے، وجہ ظاہر ہے، سیاسی ہنگاموں نے مولانا کو بالکل اپنی آغوش میں لے لیا، اور اگست کی ایک صبح کو مولانا گرفتار کر لئے گئے مولانا کی یہ گرفتاری غبار خاطر کی تخلیق کا عنوان بن گئی۔

مجموعی طور پر کاروان خیال میں نہ تو نجی خطوط کی بے ساختگی ہے اور نہ

---

[۱] آزاد کی تقریریں۔ ادبی دنیا دہلی۔ مرتبہ انور عارف بار اول۔ صفحہ ۱۶۷۔ ۱۶۶۔

غبارِ خاطر جیسی انشا پردازی، لکھنے والے کا اندازیہ تو ضرور بتاتا ہے کہ کسی کی اچانک یاد نے دل تڑپا دیا ہے مگر چونکہ کاروبارِ شوق کے لئے وہ فرصت جسے احمد نگر کے قید خانے نے فراہم کر دیا تھا اس وقت مولانا کے پاس مفقود تھی اس لئے فکر و تخیل کی کلیاں کھل کر پھول نہ بن سکیں اور صرف چند خط ہمارے ہاتھ لگ سکے، ان خطوں میں علمی، ادبی اور تاریخی معلومات کے ذخیرے ضرور پوشیدہ ہیں اور ان سے مولانا کے معمولات اور مشاغل پر بھی روشنی پڑتی ہے، مگر انشا کے اعتبار سے یہ مولانا کی تصانیف میں کمتر درجہ رکھتے ہیں، ان کا موضوعِ سخن بھی کس قدر محدود ہے زیادہ تر اس گزرے ہوئے زمانہ کی یاد ہے جو جانبین کا مشترک سرمایۂ حیات رہا ہے، اس کے علاوہ اگر کچھ ہے تو وہی سب جس کی تفصیل ہم غبارِ خاطر کے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔